تفسیر
سورۂ کوثر

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ

مَكِّيَّةٌ — آیات: ۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿١﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿٢﴾ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿٣﴾

ہم نے تجھے بخشا کوثر۔ پس اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھ اور اسی کے لیے قربانی کر۔ تیرا دشمن خود ہی منقطع ہے۔

۱۔ سورہ کا عمود اور ما قبل و ما بعد سے اس کا ربط

اگلی سورہ (سورۃ الماعون) کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بیان میں ہے جنھوں نے خانہ کعبہ کے انتظام میں خیانت کی تھی۔ انھوں نے حج اور اس کے تمام مراسم بگاڑ دیے تھے اور توحید اور غربا پروری کی سنت کو مٹا کر نماز اور قربانی کی اصل حقیقت باطل کر دی تھی جس کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی، اور وہ اس بات کے سزاوار ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دستور کے مطابق، اس نعمت کو ان سے چھین کر ان لوگوں کے سپرد کرے جو اس کے اہل ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ (سورۂ محمد) — اگر تم برگشتہ ہو جاؤ گے تو خدا تمھاری جگہ کوئی دوسری قوم چن لے گا، پھر وہ لوگ تمھاری طرح نہ ہوں گے۔

اس سے پہلے جو جماعتیں خانہ کعبہ کے اہتمام و انتظام میں خیانت و بدعہدی کی مرتکب ہوتی تھیں وہ تولیت بیت اللہ کے منصب سے محروم کر دی گئی تھیں۔ اسی دستور کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس سورہ (کوثر) کے ذریعہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی ہے کہ بیت اللہ، مسکن ابراہیم خلیلؑ کی تولیت اور اولاد ابراہیم کی امامت کے لیے خدا نے تم کو اور تمھاری امت کو منتخب کیا۔ اس گھر اور اس نسل کے ذریعہ سے خدا تمام قوموں کو برکت دے گا، جیسا کہ قرآن میں وعدہ کیا ہے اور اسی وجہ سے بیت اللہ کو مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ "سرچشمۂ برکت اور لوگوں کے لیے ہدایت" کہا ہے۔

یہ عظیم الشان عطیۂ الٰہی یقیناً ایک بہت بڑی کامیابی اور ایک خیر کثیر ہے۔ یہی کوثر اس حوضِ کوثر کا ضامن ہے، جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا۔ ان اعتبارات سے یہ سورۃ، سورۂ ما قبل کے بعد اسی طرح آئی ہے جس طرح قرآن میں عذاب کے بعد رحمت، سلب کے بعد بخشش، اور اہل دوزخ کے بعد اہلِ جنت کا ذکر آیا کرتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن مجید میں عام ہے۔

نیز چونکہ سورۂ مابعد (سورۂ کافرون) میں جوار بیت اللہ سے ہجرت کا اعلان ہے۔ اس وجہ سے نظم کلام مقتضی ہوا کہ پہلے بشارت اور تسلی کی سورہ رکھی جائے، تاکہ نظم قرآن ہی سے یہ واضح ہو جائے کہ خداوند تعالیٰ نے رنج سے پہلے راحت کا فیصلہ کر لیا ہے، اگرچہ اس کا ظہور بعد میں ہوگا۔ اسی وجہ سے سورۂ کافرون، جس میں اعلان ہجرت ہے، دو بشارت والی سورتوں یعنی سورۂ کوثر اور سورۂ نصر کے درمیان رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی بھی بشارت دی گئی تھی کہ آپ کی امت زیادہ ہوگی اور آپ کے دشمن بیت اللہ کی برکتوں سے محروم ہوں گے۔ اس وجہ سے سورہ کافرون میں اس محرومی کی اصل علت واضح کر دی گئی کہ بیت اللہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ توحید الٰہی کا ایک مرکز قائم ہو لیکن جب ان لوگوں نے اس مرکز توحید کو شرک کا اڈا بنا ڈالا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پر قابض رہیں۔

یہ سورہ کے عمود اور اس کے ربط پر ایک اجمالی نظر ہے تشفی بخش تفصیلات آگے آ رہی ہیں۔

۲۔ لفظ کوثر کی تفسیر و تاویل

اس سورہ کی صحیح تاویل لفظ "کوثر" میں چھپی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے ضرورت ہے کہ پہلے اس لفظ کی تحقیق کی جائے۔ اس کے متعلق سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں، اس وجہ سے ٹھیک معنی کو متعین کرنے کے لیے کسی قدر تفصیل ناگزیر ہوگی۔

یہ معلوم ہے کہ "کوثر" کثیر کا مبالغہ ہے۔ کثر کے معنی دولت و ثروت کے ہیں۔ اس وجہ سے کوثر کے معنی ہوں گے: بڑی کثرت اور بڑی برکت و ثروت والا۔ کثیر اور گثیر کی طرح کوثر بھی تسمیہ کے لیے مستعمل ہے۔ بطریق صفت بھی اس کا استعمال عام ہے۔ لبید کا شعر ہے ؎

وصاحب ملحوب فجعنا بموتہ   وعند الرداع بیت اخر کوثر

(اور ملحوب کا سوار جس کی موت کے غم نے ہم کو غمگین کیا اور رداع کے پاس ایک اور داتا سردار کی قبر ہے)

امیہ بن ابی عائذ الہذلی کہتا ہے ؎

یحامی الحقیق اذا ما احتدمن   وحمحمن فی کوثر کالجلال

(وہ حرمت کی حفاظت کرتا ہے، جب وہ گرم ہوتی ہیں اور ہنہناتی ہیں بادبان کی طرح پھیلے ہوئے غبار میں)

اس شعر میں موصوف مقدر ہے یعنی "فی غبار کوثر" اس سے فعل بھی مستعمل ہے چنانچہ حسان بن نشبہ کا شعر ہے ؎

ابوا ان یبیحوا جارھم لعدوھم   وقد ثار نقع الموت حتی تکوثرا

(انھوں نے اپنے پڑوسیوں کو دشمنوں کے لیے چھوڑ دینے سے انکار کر دیا اور حال یہ تھا کہ موت کے غبار نے ابھر کر تمام چھا لیا تھا)

اس وجہ سے از روئے لغت یہاں کوثر کی تین تاویلیں ممکن ہیں۔

۱۔ یہ اسمیت کی طرف منتقل ہو کر کسی خاص چیز کے لیے مخصوص ہو گیا ہو جس کا نام اللہ تعالیٰ نے "کوثر" رکھا ہو۔

۲۔ اس کو کسی ایسے موصوف محذوف کی صفت مانا جائے جس کے ساتھ اس کو خصوصیت ہو، مثلاً کہتے ہیں "مرد علی جرد" یعنی رجال مرد علی خیل جرد (نوخیز نوجوان اصیل گھوڑوں پر) قرآن مجید میں ہے "والذاریات" یعنی الریاح الذاریات (غبار

اڑانے والی ہواؤں کی قسم) ذات الواح ودسر یعنی فلک ذات الواح ودسر (تختوں اور کانٹوں والی کشتی) اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں لیکن ایسا صرف اسی صورت میں جائز ہے جب صفت اس موصوف کے لیے اس طرح مخصوص ہو کہ یا تو صفت کا ذکر کرتے ہی موصوف ذہن میں آ جائے یا کوئی واضح قرینہ اس کی طرف اشارہ کر دے۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اس کو اسماء صنف کی طرح (جو قلیل و کثیر پر یکساں دلالت کرتے ہیں اور کسی کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں رکھتے) اس کے عموم ہی پر باقی رکھا جائے۔ اس صورت میں اس کی حیثیت جامع الکلم کی رہے گی۔ اور ہر وہ چیز اس سے مراد لی جا سکے گی جس میں خیر کثیر ہو۔ البتہ قرائن کے اشارہ سے بعض افراد صنف پر اس کی دلالت زیادہ واضح ہوگی۔

یہ تین احتمالات ہیں۔ لیکن ہم اس کی تاویل میں، جیسا کہ ساتویں فصل کے بعد معلوم ہوگا، جس اصل پر نظر رکھیں گے وہ صرف سورہ کا نظم، آیات کا سیاق، اور معنی اور حسن تاویل کی رعایت ہے۔ رہے دوسرے وجوہ جن کا ہم تذکرہ کریں گے، یا روایات کی تطبیق جس سے ہم بحث کریں گے تو یہ ہم محض اس وجہ سے کریں گے کہ جو لوگ محاسن نظم اور حسن تاویل کی صحیح قدر و قیمت سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے شبہات کا ازالہ ہو سکے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کوثر کی تاویل میں وہ اقوال نقل کرتے ہیں جو سلف سے منقول ہیں۔

۳۔ کوثر کی تاویل میں سلف کے اقوال

علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے کوثر کی تاویل میں تین قول نقل کیے ہیں۔

۱۔ کوثر جنت میں ایک نہر ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، انسؓ اور مجاہد اور ابوالعالیہ سے مروی ہے۔

۲۔ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؓ، عکرمہ، قتادہ اور مجاہد سے مروی ہے۔

۳۔ کوثر جنت میں ایک حوض ہے، یہ عطا سے مروی ہے۔

میرے نزدیک ان میں سے پہلے اور تیسرے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کو موقف کا حوض اور جنت کی نہر بھی کہا گیا ہے، اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ یہ حوض اسی نہر جاری کا ہو۔ پھر حضرت عکرمہؓ ہی سے، جو کہتے ہیں کہ کوثر سے خیر کثیر مراد ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ کوثر سے مراد نبوت ہے۔ دوسری روایت ہے کہ کوثر قرآن ہے۔ اسی طرح حکمت اور اسلام کی روایتیں بھی ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام روایات کو نقل کر کے جو روایت خود اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔ انھوں نے حضرت انسؓ کی روایت پر اعتماد کر لیا ہے، اور ان اقوال میں تطبیق دینے کی زحمت نہیں اٹھائی ہے۔ حالانکہ جو جماعت دوسری بات کہتی ہے، انہی میں سے بعض پہلی بات بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح پہلی بات کے کہنے والوں میں سے بعض دوسرے قول میں بھی شریک ہیں۔ پھر یہی لوگ ہیں جن سے قرآن، حکمت، اسلام اور نبوت کی روایتیں بھی ہیں۔ نیز روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ کوثر جنت میں ایک نہر بھی ہے، اور آنحضرت صلعم نے اس کی کیفیت بیان بھی کر دی تھی، پھر اس علم

کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے اختلاف کیوں کیا؟ خصوصاً حبر الامۃ اور ترجمان قرآن ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد عکرمہ کا اختلاف تو کسی طرح سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ان کے اقوال پر غور کیا جائے، تاکہ اصل حقیقت بالکل واضح طور پر سامنے آجائے۔

۴۔ ان اقوال کا ماخذ اور اس امر کا بیان کہ ان سب کا مرجع ایک ہی جامع حقیقت ہے

جن لوگوں نے کوثر سے، جنت کی ایک نہر یا موقف کا حوض مراد لیا ہے، انھوں نے اس کو اسم مانا ہے، جو صفت سے اسمیت کی طرف منتقل ہوگیا ہے، اور اس روایت پر اعتماد کیا ہے جس میں آنحضرت صلعم نے اس حوض کے متعلق خبر دی ہے جو اللہ تعالیٰ آپؐ کو آخرت میں عطا فرمائے گا اور جو لوگ اس سے "خیر کثیر" مراد لیتے ہیں وہ یا تو اس کا موصوف یعنی "خیر" محذوف مانتے ہیں کہ موقع ذکر نعمت کا ہے، یا خود صفت ہی کو خیر کثیر کے مفہوم میں لے لیتے ہیں اور دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے۔ اس گروہ کا اعتماد مندرجہ ذیل دلائل پر ہے۔

۱۔ اگر لفظ کوثر صفت سے اسمیت کی طرف منتقل ہوا ہوتا تو اس کو نکرہ آنا چاہیے تھا، مثلاً سلسبیل، تسنیم، علییین، سجین، غسلین وغیرہ۔ اور قرآن چونکہ عربی مبین میں ہے اس کی تشریح کرتا کیونکہ نام ہونے کی شکل میں اس کا مفہوم قرآن کی تشریح کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ کوثر کو لام تعریف کے ساتھ استعمال کرنا، درآنحالیکہ وہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جس سے لوگ واقف نہیں ہیں، قرآن کے عربی مبین ہونے کے منافی ہے۔ اس وجہ سے بطریق نص وہ کسی خاص چیز کا نام نہیں ہو سکتا البتہ بطریق تاویل اس سے کوئی ایسی چیز مراد لے سکتے ہیں جس میں خیر کثیر ہو۔

۲۔ قرآن مجید کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ آخرت کی بخششوں کو یا تو بصیغۂ مستقبل ذکر کرتا ہے یا ان کو ایسے قرائن کے ساتھ بیان کرتا ہے جن سے مستقبل سمجھا جا سکے۔ مثلاً

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (والضحیٰ) — اور جلد تیرا خدا، اپنی بخشش سے تجھے خوش کر دے گا۔

يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا (بنی اسرائیل) — کہ تیرا رب تجھے مقام محمود میں کھڑا کرے۔

اس وجہ سے اگر اس سے کوئی ایسی چیز مراد ہوتی جو صرف آخرت ہی سے تعلق رکھنے والی ہوتی تو قرآن اس کو مستقبل ہی کے صیغہ سے بیان کرتا یا اس کے ساتھ کوئی ایسا واضح قرینہ ہوتا جو مستقبل پر دلیل ہوتا۔

۳۔ لفظ اپنے عموم پر باقی رہنے کی صورت میں زیادہ وسعت و جامعیت رکھتا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ قرآن دریائے معانی ہے۔ پھر لفظ کوثر خود وسعت کا مقتضی ہے، تحدید اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس وجہ سے بہتر یہی ہے گا اس کو اس کی وسعت پر باقی رکھا جائے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جو لوگ اس سے خیر کثیر مراد لیتے ہیں، وہ اس حدیث کا انکار نہیں کرتے ہیں جو آخرت کے کوثر سے متعلق وارد ہے۔ وہ لفظ کو اس کی وسعت و عمومیت پر باقی رکھتے ہیں، جس کے دائرہ میں آخرت کی بخششوں میں سے یہ جنت کی نہر بھی آجاتی ہے، اور موجودہ نعمتوں میں سے قرآن، حکمت، نبوت اور اسلام بھی۔ وہ ان سب پر اس کا اطلاق

بطریق تسمیہ و تعیین نہیں بلکہ بطریق تفصیل کرتے ہیں، یعنی لفظ کو اس کے عموم پر باقی رکھ کر، اس کے مختلف معانی میں سے اس فرد پر اس کا اطلاق کرتے ہیں جو سب سے زیادہ جامع اور اکمل ہے۔

ہمارے ان اہل تاویل کا طریقہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتے ہیں۔ اس وجہ سے کوثر سے انھوں نے قرآن بھی مراد لیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے۔ اسی طرح اس سے حکمت بھی مراد لی کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔ مَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (جس کو حکمت بخشی گئی اس کو خیر کثیر بخشا گیا) اور در حقیقت یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، کیونکہ قرآن ہی تمام جواہر حکمت کا خزانہ ہے۔ اسی اصول کے مطابق نبوت بھی اس کے دائرہ میں آگئی۔ کیونکہ فرمایا گیا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر) اسی طرح اسلام بھی اس میں داخل ہے بلکہ اسلام کی وسعت و ہمہ گیری کا حال تو یہ ہے کہ تمام کائنات اس میں سما گئی ہے۔

وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ — آسمانوں اور زمین میں جو ہیں، سب ان کے سامنے سرفگندہ ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ تمام اقوال قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط ہیں۔ اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن حقیقت ایک ہی ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ذیل میں اولاد کی کثرت، علماء و اتباع کی زیادتی، فضائل اخلاق، حسن شہرت، حسن خلق، مقام محمود اور خود اس سورہ کو اور تمام دوسرے انعامات خداوندی کو بھی داخل کیا ہے، اور اس کو ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں تو مذکورہ عمومیت میں داخل ہیں، لیکن بعض لفظ کوثر کے ساتھ کوئی واضح مناسبت نہیں رکھتیں، تاہم لفظ کی عمومیت ان سب پر حاوی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک استنباط کے لحاظ سے، سلف کی تفسیر زیادہ صاف اور جچی تلی ہے۔

اس تفصیل سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ لفظ کوثر کی تحقیق میں بہت سے مذہب نہیں ہیں، جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ صرف دو مذہب ہیں۔ ایک یہ کہ کوثر سے کوئی خاص چیز مراد لی جائے۔ یعنی حوض محشر، یا نہر جنت، یا حکمت، یا قرآن، یا اسی قسم کی کوئی اور چیز۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ عام ہے، ہر چیز جس میں خیر کثیر ہو اس کے دائرہ میں داخل ہے۔

جو لوگ اس کو کسی معین چیز کا نام قرار دیتے ہیں، ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلعم نے نہر جنت کا ذکر کوثر کے نام سے فرمایا ہے۔ اور جو لوگ اس کو نہر اور نہر کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے عام مانتے ہیں وہ حدیث اور قرآن میں تطبیق دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے قرآن کی تاویل، اس کی عبارت کے اقتضاء کے مطابق کی ہے، اور حدیث کی تاویل، اس طرح کر دی ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ پڑے۔ اس وجہ سے یہ اختلاف نہ ہوا بلکہ یہ دو تاویلوں میں جمع کی شکل ہوئی، کیونکہ عام اور خاص میں کوئی تضاد نہیں ہوتا۔

حضرت ابن عباسؓ کے دو مختلف قولوں میں اسی قسم کی تطبیق حضرت سعید بن جبیرؓ نے بھی دی ہے۔ چنانچہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت یہ کی ہے:

حدثنا ابو كريب قال ثنا عمر بن عبيد عن عطاء عن سعيد بن جبير عن ابن عباس — سعید بن جبیر ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے، اس کے کنارے

قال الکوثر نھر فی الجنۃ حافتاہ من ذھب وفضۃ یجری علی الیاقوت والدر ماءہ ابیض من الثلج واحلٰی من العسل

سونے اور چاندی کے ہیں اور وہ موتیوں اور یاقوت پر بہتی ہے۔ اس کا پانی برف سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔

دوسری روایت یہ ہے اور اسی قسم کی روایت صحیح بخاری میں بھی ہے:

قال حدثنی یعقوب قال حدثنی ھشیم قال اخبرنا ابوبشر وعطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس انہ قال الکوثر ھو الخیر الکثیر الذی اعطاہ اللہ ایاہ قال ابوبشر فقلت لسعید بن جبیر فان ناسا یزعمون انہ نھر فی الجنۃ قال فقال سعید النھر الذی فی الجنۃ من الخیر الذی اعطاہ اللہ ایاہ۔

کہا مجھ سے حدیث بیان کی یعقوب نے، کہا مجھ سے حدیث بیان کی ہشیم نے، کہا ہم کو خبر دی ابوبشر اور عباس ابن سائب نے، ان دونوں نے روایت کی ابنِ عباس سے کہ انھوں نے کہا کہ کوثر وہ خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو بخشا۔ ابوبشر کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر سے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کوثر جنت کی ایک نہر ہے، تو سعید نے جواب دیا کہ یہ جنت کی نہر اسی خیر کثیر میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بخشا ہے۔

یہ دو قولوں کے درمیان تطبیق کی شکل ہے۔ یعنی خاص اور عام میں توفیق پیدا کر دی گئی ہے۔

اب اگر قرآن اور حدیث کے درمیان کامل تطبیق کے لیے یہ کہا جائے کہ جو کوثر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلعم کو دنیا میں عطا فرمایا ہے، وہی اپنی حقیقی شکل میں موقف کا حوض اور جنت کی نہر ہے تو یہ تطبیق زیادہ بہتر ہوگی اور باعتبار تاویل بھی یہ تاویل زیادہ مناسب اور خوب صورت ہے۔ ہم آئندہ فصلوں میں اسی اجمال کی شرح کریں گے۔

۵- چند اشارات کہ کوثر، خانہ کعبہ اور اس کا ماحول ہے

پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثر آخرت کے بارہ میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کی عمومیت اور صیغہ ماضی کی رعایت سے ان چیزوں کو بھی اس کے دائرہ میں داخل کر دیا ہے، جو داخل ہو سکتی تھیں۔ تاکہ لفظ عام، وسیع اور اپنی دلالت میں اسم بامسمّیٰ (کوثر) ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس میں مزید جستجو اور کاوش جائز سمجھی۔ اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی اس میں کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے۔ اس وجہ سے اگر میں کسی ایسی تاویل کا سراغ لگاؤں، جو دونوں کوثروں کو ایک کر دے تو جس طرح میں سلف کو اس کی تاویل میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں پاتا، اسی طرح اپنے کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا۔ البتہ یہ فرق ہوگا کہ انھوں نے اس کو عام قرار دے کر اس سے حوض یا نہر جنت سمجھی، اور ان کے ماسوا ہر وہ چیز جس میں خیر کثیر ہو، مثلاً قرآن، حکمت، اسلام، نبوت، جن کو حوض یا نہر سے کوئی مناسبت نہیں ہے، مگر میں اس سے وہ چیز مراد لوں گا جس کو اس حوض یا نہر سے نہایت واضح مشابہت ہے جس کی کیفیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں، اور جس کی حقیقت و روحانیت، شب معراج میں، آپؐ کے سامنے بے نقاب ہوئی۔

کیونکہ یہ ثابت ہے کہ اس مبارک رات میں، جب پروردگار عالم نے اس عالم آب وگل کی بہت سی چیزوں کے حقائق آپؐ کے لیے بے حجاب کیے تو اس کوثر کی روحانیت کا بھی آپؐ کو مشاہدہ کرایا جو اس دنیا میں آپؐ کو بخشا گیا۔

عالمِ غیب کے جو اسرار آپؐ پر بے نقاب ہوتے تھے، آپؐ کبھی ان کا ذکر تصریحاً فرماتے تھے۔ مثلاً سورۂ بقرہ اور آل عمران کے متعلق فرمایا: "وہ دونوں بدلیوں کی شکل میں نمودار ہوں گی۔" دنیا کی بابت فرمایا۔ "وہ ایک پھوسٹ بڑھیا کی شکل میں آئے گی۔" موت کی نسبت فرمایا: "وہ ایک مینڈھے کی صورت میں آئے گی۔" اور کبھی صرف اشارہ فرما دیتے تھے تاکہ لوگ اس پر تدبر کریں، اور ان کے ذہن و عقل کی تربیت ہو۔ اس وجہ سے یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ آنحضرت صلعم نے تصریحاً کہیں یہ نہیں فرمایا کہ خانہ کعبہ قیامت کے دن حوض کوثر کی شکل میں نمودار ہوگا، کیونکہ آپؐ نے اس کی طرف اشارات فرمائے ہیں اور ہم کو ان اشارات پر غور و فکر کی ترغیب دی ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جو ہمارے دعویٰ پر حجت ہیں۔

۱- یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے نفوس کے اندر، خدا کی طرف ایک فطری شوق و رغبت موجود ہے۔ نفس انسانی اس چیز سے محروم رہ کر تسلی نہیں پا سکتا۔ انسان کی یہی فطرت مذاہب و ادیان کے وجود کا باعث ہوئی ہے۔ اسی اشتیاق و بیقراری کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کی کوئی قوم مذہب سے خالی نہیں پاتے۔

اب سوچو اس فطری اشتیاق اور چاہ کی سب سے زیادہ موزوں تعبیر "پیاس" کے سوا اور کس چیز سے ہو سکتی ہے؟ زبور میں یہی تمثیل اکثر استعمال ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو پیش نظر رکھ کر ان عاشقانِ توحید کے حال پر غور کرو، جو حج کے ایام میں، بیت اللہ کے پاس سراپا شوق و آرزو ہو کر جمع ہوتے ہیں۔ کیا ان کی مثال، ان خشک لب پیاسوں کی نہیں ہے جو شدید تشنگی سے مضطر ہو کر کسی حوض کے پاس جمع ہو گئے ہوں؟ اگر یہ مشابہت واضح ہے تو لامحالہ خانہ کعبہ ان کے لیے دنیا میں اس حوض کوثر کی مثال ہے، جس پر میدانِ حشر میں وہ یکجا ہوں گے۔

۲- آنحضرت صلعم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

ارأیتم لو ان نھرا بباب احدکم یغتسل فیہ کل یوم خمساً (الحدیث)

بھلا بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو........

یہ تمثیل بھی ایک دوسرے پہلو سے پانی ہی کی تمثیل ہے۔ پانی جس طرح سیرابی کا ذریعہ ہے، اسی طرح طہارت کا بھی ذریعہ ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ ہماری تمام نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے، اس اعتبار سے ہماری تمام مسجدیں گویا اسی سرچشمہ کی نہریں ہیں، جن سے ہم سیرابی اور پاکی حاصل کرتے ہیں۔

۳- خانہ کعبہ کے اجتماع سے جس طرح دوسری امتوں کے مقابل میں، امتِ مسلمہ کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے اسی طرح حوض کوثر پر اس کا اجتماع اسی کی کثرت کے اظہار کا سبب ہوگا۔ اس کثرت کے ظاہر کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ کسی ایک مخصوص مقام پر اس کا اجتماع ہو۔ دوسری امتیں اس اجتماع سے اندازہ کرتی ہیں، کہ زائرینِ بیت اللہ کا یہ متلاطم سمندر اس بحر بیکراں کا صرف ایک قطرہ ہے، جو پوری سطح ارض پر پھیلا ہوا ہے۔ پس جس طرح حوض کوثر پر اس کے اجتماع سے دوسرے انبیاء کی امتوں

پر اس کی کثرت واضح ہوگی، اسی طرح موسم حج میں، خانۂ کعبہ کے پاس اس کا اجتماع اظہارِ کثرت کا ایک جلوہ ہے۔ غور کرو لفظ کوثر ان دونوں کی مطابقت کو کس طرح واضح کر رہا ہے۔

۴۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ آپؐ اپنی امت کو حوضِ کوثر پر وضو کے آثار سے پہچانیں گے۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ خلوص قلب کے ساتھ اس گھر کی زیارت کریں گے وہی لوگ آخرت میں اس حوض پر آئیں گے جو اس گھر کی حقیقت ہے۔

۵۔ فتح مکہ کو خدا نے امت کی کثرت کا سبب بنایا۔ چنانچہ حج اکبر کے بعد لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

۶۔ مسجد حرام کو خدا نے مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ	بلاشبہ خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے تعمیر ہوا، وہ ہے جو مکہ میں ہے، سرچشمۂ خیر و برکت اور لوگوں کے لیے ہدایت۔

اس گھر کو خدا نے ایسی برکت سے نوازا کہ تمام عالم اس کی برکتوں سے مالا مال ہوا۔ جیسا کہ ابراہیم خلیلؑ سے وعدہ کیا گیا تھا، حضرت اسمٰعیلؑ کی ذریت میں خدا کی برکت حضرت اسحٰقؑ کی ذریت سے زیادہ ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل سورۂ فیل میں گزر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام برکتیں اسی بیت اللہ اور نماز و قربانی کا ثمرہ ہیں۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے قرآن کو بھی مبارک کہا ہے۔ اس وجہ سے حوضِ کوثر کے ساتھ قرآن کی مشابہت بھی واضح ہے۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ قرآن کو مبارک دوسرے پہلو سے کہا گیا ہے۔ جس طرح بارش کو خدا نے مبارک کہا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی مبارک کہا ہے۔ بارش آسمان سے برس کر مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور قرآن نے آسمان سے نازل ہو کر مردہ دلوں کو زندہ کر دیا۔ قرآن کو مبارک کہنے میں حوض سے مشابہت کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن کی عظمت اور بے پایاں وسعت کے لحاظ سے یہ تشبیہ بلاغت کے خلاف ہوگی۔

۷۔ یہ سورہ صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی ہے جو فتح مکہ، حج، نماز، قربانی، غلبۂ اسلام اور کثرت امت کا فتح باب ہے۔ یہاں تک کہ خدا نے اس صلح کو "فتح مبین" سے تعبیر کیا۔ سورہ کے زمانۂ نزول پر، چودھویں فصل میں مفصل گفتگو ہوگی۔

۸۔ آنحضرت صلعم نے اس حوض کے ایک گوشہ کے متعلق خبر دے کر باقی کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں مروی ہے۔

قال علیہ السلام ما بین بیتی ومنبری روضۃ من ریاض الجنۃ ومنبری علی حوضی۔	آنحضرت صلعم نے فرمایا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، اور میرا منبر میرے حوض کے اوپر ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مبارک سرزمین، جس میں حجاج یک جا ہوتے ہیں، اس حوضِ کوثر کی شکل اختیار کرے گی جس کی آنحضرت صلعم نے خبر دی ہے۔ میرے نزدیک بخاری کی مندرجہ ذیل روایت (مذکورہ نمبر ۹) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن نکلے، ایک شخص کے جنازہ کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف لائے (یعنی منبر مسجد پر) اور فرمایا۔

انی فرط لکم وانا شہید علیکم وانی واللہ لانظر الی حوضی الان وانی اعطیت مفاتیح خزائن الارض او مفاتیح الارض وانی واللہ ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی ولکن اخاف علیکم ان تنافسوا فیہا۔	میں تمہارے لیے حوض پر آگے جانے والا ہوں، اور تمہارے لیے شہادت دوں گا، اور قسم خدا کی میں اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں یا (راوی کو شبہ ہے) آپ نے یہ فرمایا کہ زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ اور مجھے، خدا کی قسم تم سے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کروگے، لیکن اس بات کا ڈر ہے کہ بھاگ دوڑ طلب دنیا کی راہ میں ہو جائے۔

"فرط" عربی میں، اس شخص کو کہتے ہیں جو حوض پر پہلے سے پہنچ کر قافلہ کے لیے ڈول اور رسی وغیرہ کا انتظام کر کے حوض کو بھر رکھتا ہے۔ "شہید علیکم" سے یہ مطلب ہے کہ آپؐ اپنی امت کو پہچانیں گے، اور جو لوگ آپؐ کی امت میں سے ہوں گے ان کے امت میں سے ہونے کی گواہی دیں گے، یہ آپؐ کی طرف سے شفاعت ہوگی۔

ان لفظوں میں آپؐ نے ان حالات کو بیان فرمایا ہے جو آخرت میں پیش آئیں گے۔ پھر آپؐ نے اشارہ فرما دیا کہ اس حوض کوثر کی ظاہری تمثال آپ کے سامنے ہے، کیونکہ، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، آپؐ کا منبر آپؐ کے حوض کے اوپر ہے۔ اور یہ جو آپؐ نے فرمایا: مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، تو اس سے فتح مکہ کے اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا، چنانچہ فتح مکہ تمام زمین اور اس کے خزانوں کی فتح کا دیباچہ ثابت ہوئی۔

۱۰۔ آنحضرت صلعم نے ظاہر فرما دیا ہے کہ آپؐ کے حوض کا طول مکہ اور مدینہ کے مابین مسافت جتنا ہے۔ اس لطیف اشارہ سے ارض حرم اور آپؐ کے حوض کی مطابقت بھی واضح ہوگئی۔

لیکن اس جگہ ایک شخص کے دل میں خدشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مراد یہی تھی تو اس کو کھول کر کیوں نہیں فرما دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس حقیقت کی تعبیر کے لیے قرآن مجید نے جو لفظ انتخاب کیا ہے، وہ بے شمار حقائق و معارف کا گنجینہ اور ہمارے لیے دعوت تفکر ہے۔ یہ ایک لفظ امت کی کثرت، مکہ کی فتح، ایام حج میں خانہ کعبہ کے پاس، اور محشر میں حوض کوثر پر، امت کے اژدحام کو بیک وقت ظاہر کر رہا ہے۔

یہ تمام اشارات ہم نے اس مقصد کی تمہید و تائید کے لیے یک جا کیے ہیں جو نظم کلام سے واضح ہو رہا ہے اور جس کی تفصیل انشاء اللہ اگلی فصلوں میں آئے گی۔

اب تھوڑی دیر توقف کر کے حوض کوثر کی شکل و ہیئت پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بھی ہمارے مذکورہ نظریہ کی تائید ہو رہی ہے کہ کوثر آخرت درحقیقت خانہ کعبہ اور اس کے ماحول ہی کی روحانی تصویر ہے۔ بعد کی فصل میں اس اجمال کی تفصیل ہے۔

۶۔ نہر کوثر خانہ کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانیت کی تصویر ہے

معراج میں جو نہر کوثر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کرائی گئی تھی، اس کی صفات پر جو شخص بھی غور کرے گا، اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی مثال ہے۔ اس کے متعلق مختلف طریقوں

سے جو روایات مروی ہیں ان کی مشترک حقیقت یہ ہے، کہ کوثر ایک نہر ہے، اس کے کناروں پر مجوف موتیوں کے محل ہیں، اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد کی ہے۔ اس میں ظروف ہیں جو آسمان کے ستاروں کے مانند ہیں۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں، برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے۔ اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ اس پر چڑیاں اترتی ہیں، جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں۔ ایک شخص نے کہا تب تو وہ بہت ہی خوش قسمت ہوں گی۔ آپؐ نے فرمایا: ان کے کھانے والے ان سے بھی زیادہ خوش قسمت ہوں گے۔ اس کے پانی کی آواز ایسی محسوس ہوگی جیسے تم اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے ہو۔

یہ تفصیلات ہم نے تمام روایات جمع کر کے یکجا کی ہیں۔ بخاری میں یہ الفاظ ہیں۔

بینا انا اسیر فی الجنة اذا انا بنهر	میں جنت میں گشت کر رہا تھا کہ ناگہاں ایک نہر پر
حافتاه قباب الدر المجوف فقلت ما	گزر ہوا، اس کے دونوں کناروں پر مجوف موتیوں کے محل
هذا یا جبریل قال هذا الکوثر	تھے۔ میں نے جبریل سے پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے
الذی اعطاك ربك قال فضرب	جواب دیا یہ وہ کوثر ہے جو آپ کو آپ کے رب نے بخشا
الملك بیده فاذا طینه مسك	ہے۔ فرمایا پھر فرشتہ نے زمین پر ہاتھ مارا تو اس کی مٹی
اذفر۔	نہایت خوشبودار مشک تھی۔

اب ایک لمحہ توقف کر کے کعبہ اور اس کے ماحول کے مشاہدات پر غور کرو، جب تمام اکناف عالم سے جاں نثارانِ توحید کے قافلے، عشق و محبت الٰہی کی پیاس بجھانے کے لیے اس چشمۂ خیر و برکت کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں۔ کیا ان کے احساسِ روحانی میں اس مقدس وادی کے سنگریزے، یاقوت و زمرد سے زیادہ پر جمال، اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار، اور اس کے اردگرد حجاج کے خیمے، مجوف موتیوں کے قبوں سے زیادہ حسین و خوبصورت نہیں ہیں؟ پھر حجاج اور ان کے ساتھ قربانی کے اونٹوں کی قطاروں پر ایک نظر ڈالو۔ کیا یہ ایک چشمہ کے کنارے لمبی گردن والی چڑیوں کا جھنڈ نہیں ہے؟ پھر ان کی خوش بختی اور فیروز مندی پر غور کرو۔ یہ اشرف المخلوقات انسان کے قائم مقام بن کر خدا کے سامنے قربان ہوں گے۔ گویا وہ بمنزلہ انسان ہیں۔ ان سے بڑھ کر خوش بخت اور فیروز مند کون ہو سکتا ہے! پھر ان کے خوش قسمت کھانے والوں کو دیکھو، یہ کون ہیں؟ اللہ کے مہمان؟ کیا اللہ کے مہمانوں سے بھی بڑھ کر کسی کا نصیبہ اچھا ہے؟

ایک نگاہِ تعمق اس تشبیہ کے محاسن پر بھی ڈالو، حوض پر اترنے والی چڑیوں کو، قربانی کے اونٹوں سے تشبیہ دے کر اور ان کے کھانے والوں کا ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ چڑیوں سے مقصود یہی قربانی کے اونٹ ہیں۔ پھر اشارہ کتنا لطیف ہے۔ چڑیاں کی گردنوں کو قربانی کے اونٹوں کی گردن سے تشبیہ دی ہے کہ اس جزء سے پورے کل پر روشنی پڑ جائے۔ نیز دیکھو! "بدن" کا لفظ استعمال نہیں فرمایا، بلکہ "جزور" کا لفظ استعمال کیا جس کی عمومیت میں ابہام ہے۔

تم پوچھ سکتے ہو کہ اتنی رازداری اور اس قدر اشارات و کنایات کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تاکہ عقل سلیم اس سے حقائق کا استنباط کرے۔ اللہ تعالیٰ جب قرآن میں دلائل حکمت کی تفصیل کرتا ہے تو آخر میں عموماً یہ آیت

آتی ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (اس میں غور کرنے والوں کے لیے بہت سی دلیلیں ہیں) کہیں کہیں "یَعْلَمُوْنَ" اور "یَتَفَكَّرُوْنَ" کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ جس طرح قرآن مجید سراپا دعوتِ فکر و نظر ہے، اسی طرح اس کا حامل بھی بہترین معلم تھا۔ وہ عقل انسانی کی تربیت کرتا تھا، اور اس کو اکتسابِ حکمت کے لائق بناتا تھا۔ اس تربیت عقل کے لیے آپ بسا اوقات صحابہؓ سے بعض امور کی مخفی مناسبتوں کے متعلق سوالات بھی کرتے رہتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ آپؐ نے پوچھا درختوں میں سے مومن سے مشابہت رکھنے والا کون سا درخت ہے؟ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام امثال میں گفتگو فرماتے تھے۔ لوگوں نے سوال کیا کہ آپ کھول کر بات کیوں نہیں کہتے؟ انھوں نے جواب دیا "تاکہ عقلاء ہی سمجھیں" بعینہٖ یہی حقیقت قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا	یہ مثلیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، لیکن اس کو وہی
یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ۔	سمجھیں گے جو اہل علم ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اشارات کو تعلیم و تربیت میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۷۔ یروشلم کی روحانیت

ہم کے گزشتہ فصل میں خانہ کعبہ کی روحانیت کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، مکاشفات یوحنا باب ۲۱ میں اسی کے مشابہ یروشلم کی روحانیت بھی بیان کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

اور وہ مجھے روح میں ایک بڑے اور اونچے پہاڑ پر لے گیا اور شہر مقدس یروشلم کو خدا کے پاس سے اترتے دکھایا۔ اس میں خدا کا جلال تھا۔ اور اس کی چمک نہایت قیمتی پتھر یعنی اس یشب کی سی تھی، جو بلور کی طرح شفاف ہو (اس کے بعد اس کی شہر پناہ، مسافت، دروازوں اور اس کے رہنے والوں یعنی خاندان اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تفصیل کے بعد کہا) اور اس کی شہر پناہ کی تعمیر یشب کی تھی، اور شہر ایسے خالص سونے کا تھا جو شفاف شیشے کے مانند ہو۔ اور اس شہر کی شہر پناہ کی بنیادیں ہر طرح کے جواہر سے آراستہ تھیں، پہلی نیاد یشب کی تھی، دوسری نیلم کی، تیسری شب چراغ کی، چوتھی زمرد کی، پانچویں عقیق کی چھٹی لعل کی، ساتویں سنہرے پتھر کی، آٹھویں فیروزے کی، نویں زبرجد کی، دسویں مینی کی، گیارھویں سنگ سنبلی کی اور بارھویں یاقوت کی، اور بارہ دروازے بارہ موتیوں کے تھے، ہر دروازہ ایک ایک موتی کا تھا، اور شہر کی سڑک شفاف شیشے کے مانند خالص سونے کی تھی۔" (اس کے بعد کہا ہے کہ) "اس میں کوئی مقدس نہیں ہے اور اس میں صرف ایک خدا کی عبادت ہوگی۔"

ممکن ہے کہ نقل و روایت میں کچھ کمی بیشی کر دی گئی ہو۔ ہمارا مقصد اس سے صرف یہ دکھانا ہے کہ دنیا میں جو اعیان و اماکن ہیں، ان کی روحانی مثال کا خیال ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے۔

یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں صرف ان صفات کا تذکرہ کیا ہے جو قوت باصرہ کی گرفت میں آتی ہیں لیکن کعبہ کی جو روحانیت بیان ہوئی ہے اس میں ہر حاسہ کے لیے حلاوت ہے۔ یہاں تک کہ پانی کی روانی کی آواز کا بھی ذکر ہے۔ اور ایک پیاسے کے لیے، دور سے پانی کی روانی کے نغمہ سے زیادہ شیریں اور جان فزا نغمہ کیا ہو سکتا ہے! پھر جو دیدارِ الٰہی کی پیاس سے تڑپ رہے

ہیں، ان کے لیے شیریں اور ٹھنڈے پانی کی سیرابی اگر نہیں ہے تو کیا ہے؟ حضرت مسیح نے انہیں ہی کے بارہ میں فرمایا ہے:

"مبارک ہیں وہ جو بھوکے اور پیاسے ہیں کیونکہ وہی آسودہ ہوں گے۔"

۸۔ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ کی تفسیر

لفظ کوثر کا ٹھیک ٹھیک مطلب معلوم ہو جانے کے بعد پہلی آیت کی تفسیر واضح ہو گئی۔ یعنی پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے برکت اور کثرت امت کی جو گرانمایہ دولت مقدر تھی، اس آیت میں اسی کا پیام بشارت ہے۔ جب اس وعدہ کی تکمیل کا وقت قریب آگیا تو اس کی خبر دے دی گئی تاکہ آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کے لیے اسلام کا غلبہ اور مکہ کی فتح کی خوشخبری ہو یعنی سادہ لفظوں میں یوں کہا گیا: اللہ تعالیٰ نے تم کو نماز پڑھنے والی اور راہِ خدا میں خرچ کرنے والی ایک عظیم الشان امت دی ہے جو بیت اللہ الحرام کا حج کرے گی۔ سورہ حج میں یہی مضمون تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ
مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا
تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا وَّطَهِّرْ
بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ
وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ
وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ
یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی
كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ
كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ
لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ
وَیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ
فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی
مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ
بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ
الْفَقِیْرَ

یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کے پاس آباد کیا اور یہ ہدایت کی کہ میرا کسی کو ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور میری عبادت میں کھڑے ہونے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں (یعنی نماز پڑھنے والوں) کے لیے پاک رکھنا، اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، وہ تمہارے پاس پیادہ اور لاغر اونٹوں پہ گہرے راستوں سے آئیں (یعنی خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے قریب سے پیادہ آئیں اور دور دراز گوشوں سے سدھائے ہوئے لاغر اونٹوں پہ۔ اور مکہ میں ہر راہ سے داخل ہوں۔ یہاں تک کہ آمد و شد کی کثرت سے راستے گہرے ہو جائیں) تاکہ اپنے منافع کی جگہ پر آئیں (یعنی یہ شہر ان کا مرکز بنے گا، وہ اس کی تجارت سے منفعت حاصل کریں گے۔ اور اس میں ان کا باہمی میل جول، ان کے اجتماعی رشتوں اور رحمی تعلقات کے استحکام کا ذریعہ ہوگا۔ چنانچہ عرفات کے اجتماع میں خطیب ان کو صلح اور صلۂ رحم کی دعوت دیتا تھا اور اسی وجہ سے عرب مکہ کو صلاح، اور ام الرحم بھی کہتے تھے۔ اس سے زیادہ معاشی اور اجتماعی فوائد اور کیا ہو سکتے ہیں؟) اور چند متعین دنوں میں۔ ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو روزی کیے ہیں ان کا نام لیں (یہ دینی منفعت ہے۔ عرب نے باوجود شرک کے خدا کو نہیں چھوڑا تھا البتہ اس کے دربار کے لیے شفعاء ٹھہرا لیے تھے) پس اس میں سے کھاؤ اور تنگ حال فقیر کو کھلاؤ۔

(حج ۲۶-۲۷-۲۸)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ ایک عظیم الشان امت کے لیے، توحید، نماز، اور اطعام فقراء کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اور

یہ امت دنیا کے تمام گوشوں سے اس گھر کے حج کے لیے مجتمع ہوگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اس عظیم الشان امت کے لیے ایک نبی مبعوث فرمائے۔ یہ دعا قبول ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے ان کی ذریت کی کثرت کا وعدہ فرمایا تھا۔ اور توریت میں ہے کہ کثرت ذریت کا وعدہ حضرت اسمٰعیل کی نسل میں خاص طور پر پورا ہوگا۔ چنانچہ اہل کتاب کو بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو اس بخشش کی خوشخبری آپ کی بعثت کے شروع ہی میں دے دی تھی۔ چنانچہ سورہ الضحیٰ میں ہے۔

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی — جلد تیرا خدا اپنی بخشش سے تجھے خوش کر دے گا۔

یہی وعدہ جس کے قرب کا ذکر فرمایا تھا، اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ کہہ کر پورا کر دیا۔ اب لفظ کوثر کو سامنے رکھ کر فَتَرْضٰی کی تفسیر پہ غور کرو۔ رحمت عالم کو غایت رحمت کی وجہ سے، لوگوں کی ہدایت و اصلاح کی جو بے پایاں آرزو تھی وہ نہ تو ایک محدود امت کے ایمان و اسلام سے پوری ہو سکتی تھی، اور نہ اس طرح پوری ہو سکتی تھی کہ دنیا میں تو آپؐ کے متبعین کی کثرت ہو، لیکن آخرت میں یہ نعمت چھن جائے۔ اور حوض کوثر پر ان کی تعداد تھوڑی رہ جائے۔ فَتَرْضٰی اور "اَلْکَوْثَر" کے الفاظ نے ان تمام شبہات کا ازالہ کر دیا۔ چنانچہ ایک سے زیادہ صحیح احادیث میں آپؐ کی امت کی کثرت کا ذکر آیا ہے۔

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں پہلی آیت پر غور کرو! اس میں متعدد بشارتیں پنہاں ہیں۔

۱۔ مکہ عنقریب فتح ہوگا۔

۲۔ لوگوں کی کثیر تعداد، آپ کی امت میں داخل ہوگی۔

۳۔ ان لوگوں کے گمان کے خلاف جو کہتے ہیں کہ اس امت کا بڑا حصہ مرتد ہو جائے گا۔ اس کا ایک بڑا طبقہ دینِ حق پر قائم رہے گا۔

ان کے علاوہ اور متعدد بشارتیں اس سورہ میں پنہاں ہیں جن کی تفصیل بعد میں آئے گی۔ یہ پوری سورہ بشارتوں کا مجموعہ ہے۔ وللہ الحمد۔

۹۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ کی تفسیر اور ماقبل سے اس کا تعلق

اس آیت سے چار اہم حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔

۱۔ نماز اور قربانی کو اس کوثر کے عطیہ سے کوئی خاص تعلق ہے، کیونکہ صیغہ امر پر ف داخل ہے اور عربی زبان میں یہ ف سابق اور لاحق میں تعلق کی دلیل ہوتی ہے۔

۲۔ نماز اور قربانی کو، عام طور پر الگ الگ کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اور مخصوص ایام حج میں ایک ساتھ کرنے کا بھی۔

۳۔ نماز اور قربانی میں باہمدگر کوئی خاص تعلق ہے۔

۴۔ یہ عطیہ ہمارے لیے مخصوص ہے۔ نیز یہ کہ نماز اور قربانی دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

اس آخری چیز سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر صرف ہم ہی ہیں۔ مشرکین اور یہود و نصاریٰ

اس شرف سے محروم ہیں۔ مشرکین اس لیے کہ ان کی نماز اور قربانی اللہ واحد کے لیے نہیں تھی۔ یہود اس وجہ سے کہ انھوں نے صرف قربانی لے لی۔ اور نماز غائب کردی۔ نیز ان کی قربانی نحر نہ تھی۔ نحر کا لفظ اونٹ کی قربانی کے لیے مخصوص ہے۔ اور اونٹ ان کے ہاں حرام تھا۔ نصاریٰ، اس وجہ سے کہ ان کے ہاں قربانی سرے سے ہے ہی نہیں، اور نماز ان کے خیال میں واجب نہیں ہے۔ یہ مجمل اشارات ہیں یہاں ان کی تفصیل کی ضرورت ہے۔ ہم متعدد فصلوں میں ان اشارات کی شرح کریں گے۔

پہلی دو باتیں تو اس فصل میں بیان کیے دیتے ہیں۔ باقی دو باتوں کی تفصیل آئندہ فصلوں میں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے، آنحضرت صلعم کو اس عطیہ کی بشارت دینے کے بعد دو باتوں کا حکم دیا؛ نماز اور قربانی۔ اور امر کے صیغہ پر تعقیب کی ف داخل کی۔ قواعد زبان کے اعتبار سے تعقیب کی ف سابق ولاحق یعنی عطیہ اور حکم کے درمیان نسبت اور تعلق کی دلیل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہم نے نظم کلام پر غور کیا، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ربط کے بعض پہلو معلوم ہوئے جو ذیل میں ہم بترتیب بیان کرتے ہیں۔

۱۔ اس حکم میں، اس بخشش کا اصلی مقصود پنہاں ہے، کیونکہ یہ بخشش بہت بڑے مقصد کے لیے تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج ۴۱)

جو اگر ہم ان کو زمین (مکہ) میں قبضہ دیں، تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے۔ منکر سے روکیں گے۔

ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے فرمایا گیا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِىْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِىْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِىْٓ اِلَيْهِمْ۔

اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس بن کھیتی کی زمین میں، تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسایا ہے اے ہمارے پروردگار! اس لیے کہ یہ نماز قائم کریں، پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کردے (یعنی لوگ ان کے پاس تیرے گھر کی زیارت کے لیے آئیں)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے قدیم وطن سے ہجرت کرکے ایک بے آب وگیاہ سرزمین میں بسنا، محض اس لیے تھا کہ اللہ واحد کی عبادت کا ایک مرکز تعمیر ہو۔ جو لوگوں کی عقیدت وانابت، سعی وطواف اور نذرونیاز کا قبلہ بنے۔ اور جس طرح غلام اپنے آقا کی ڈیوڑھی پر گوش برآواز سرگرم خدمت رہتے ہیں، اسی طرح لوگ اس گھر کی طرف لبیک لبیک، لاشریک لک لبیک، کہتے ہوئے بڑھیں۔ اور اپنے امام کی زبان سے گھر والے کے اوامر ونواہی سے آگاہ ہوں۔ اسی لیے فرمایا ہے،

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ

اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو کہ وہ تمہارے پاس آئیں۔

(یعنی تمھارے پاس حکمت ومعرفت کی باتیں سننے آئیں کیونکہ جس طرح مکہ کے لوگوں کے لیے مرکز اور سرچشمۂ برکت وہدایت تھا، اسی طرح حضرت ابراہیمؑ لوگوں کے امام تھے۔ اس لیے آپ لوگوں کی میزبانی کرتے تھے اور ان کی اصلاح وہدایت کے لیے ان کے سامنے خطبہ دیتے تھے۔ ابتدائے بعثت میں آنحضرت صلعم نے تبلیغ دین کے ارادہ سے اپنے خاندان کے لوگوں کی

جو دعوت کی تھی وہ بھی اسی سنت ابراہیمی کی پیروی تھی۔ حج کے دوسرے مراسم کے ساتھ، جیسا کہ ہم سورۂ بلد کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں، خطبہ کی یہ سنت بھی حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے بعد باقی رہی۔)

پھر نیاز کے جو جانور ساتھ لائے ہیں ان کا گوشت خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔ اور شکر گزار ہوں کہ آقا نے خود اپنی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے سوغات بخشی اور پھر خود اس کو قبول فرما کر غلاموں کو سرفراز فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ اس گھر کی تعمیر نہایت عظیم الشان مقاصد کے لیے ہوئی ہے اور خدا نے انھیں مقاصد کی خدمت اور تکمیل کے لیے آنحضرت صلعم کو اس پر قبضہ دیا ہے۔ ان مقاصد کا لب لباب دو چیزیں ہیں۔ نماز اور قربانی۔ پس اس عطیہ کے ذکر کے بعد ان دونوں چیزوں کا ذکر کردیا کہ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ عطیہ یوں ہی نہیں مل رہا ہے بلکہ اس کے کچھ حقوق وفرائض ہیں جن کا اہتمام اصلی مقصود ہے۔ یہ بقائے حقوق کے عام اور معروف قانون کے مطابق ایک مسلم حق کا اظہار کیا گیا ہے کیونکہ کوئی عطیہ بغیر کسی فرض کی ذمہ داری کے نہیں ملا کرتا۔ جب ہم کچھ لے رہے ہیں تو لامحالہ ہم کو کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بھی آمادہ رہنا چاہیے۔ مندرجہ ذیل آیات میں جو بات فرمائی گئی ہے اس کی بنیاد اسی حقیقت پر ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ فِىْ مَآ اٰتٰىكُمْ

تاکہ تم کو جو کچھ دیا ہے، اس میں آزمائے۔

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ

اللہ نے جس طرح تم پر احسان فرمایا، اسی طرح تم دوسروں کے ساتھ احسان کرو۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ

اور اس کی کٹائی کے دن اس کا حق دو۔

۲۔ ربط کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس عطیہ کے ذکر کے بعد اس چیز کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کے بقا وقیام کی بنیاد ہے، چنانچہ نماز اور قربانی کا حکم تمام امت کے لیے عام ہوا، کیونکہ یہ نعمت بھی پیغمبر اور آپ کی امت کے لیے عام تھی۔ پیغمبر، امت کا وکیل ہوتا ہے، اس وجہ سے جو کچھ اس کو ملتا ہے، اس میں امت بھی برابر کی شریک ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے جیسا کہ گزر چکا ہے کہ "میں تمہارے لیے حوض پر آگے جانے والا ہوں" پس یہاں نماز اور قربانی کا حکم عام ہے، یہ بات سیاق کلام سے ظاہر ہو رہی ہے۔

جب کوئی عبادت کسی عطیہ کے ساتھ مخصوص کردی جائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی پابندی ہی اس نعمت کے بقا کی ضامن ہوسکتی ہے۔ اسی حقیقت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (رعد ۱۱)

اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنے وعدوں کو اس وقت تک نہیں بدلا کرتا، جب تک وہ قوم اپنی ذمہ داریوں میں تبدیلی نہ کردے۔

یہاں جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے، ہم کو حج اور اس کے دوسرے آداب ومناسک کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ ہم نے تم کو کوثر بخشا، پس اس کے حقوق ادا کرتے رہو تاکہ یہ نعمت تمہارے لیے ہمیشہ باقی رہے۔ چاہے نماز اور حج کو الگ الگ لو یا دونوں کو ایک ساتھ لو، مراد اس سے حج ہی ہے، کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ حج نماز ہی میں سے ہے۔ حج کے اعمال ومراسم سے بھی اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے اور یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ بیت اللہ کا مقصد نماز ہی ہے اور اسی مقصد کے لیے

اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ جس شخص نے استطاعت کے باوجود اس گھر کا حج نہ کیا، اس نے اس کا مقصد پورا نہیں کیا۔ بعینہٖ یہی حال قربانی کا ہے۔ جس نے حج کی قربانی کی سعادت حاصل نہ کی، وہ درحقیقت اصلی قربانی سے محروم ہے۔ جو شخص اسی قربانی کے علاوہ کوئی قربانی کرتا ہے، وہ مجاز سے صرف ایک گونہ مشابہت حاصل کرتا ہے، اور یہ قربانی کر کے گویا وہ ایک دن حقیقی قربانی کی سعادت کے حصول کی تمنا ظاہر کر رہا ہے۔

بہرحال! جو پہلو بھی اختیار کرو، آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج امت پر لازم ہے، اور جو شخص حج سے بے پروا ہوا، اس نے گویا اپنے آپ کو امت کے حلقہ سے الگ کر لیا۔ حج کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد، یہ بات بالکل غیر مشتبہ طور پر سامنے آجاتی ہے۔ قرآن مجید اور احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ (آل عمران ۹۷)	اور لوگوں پر، اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج کرنا ہے جس کو استطاعت ہو، اور جو کفر کرے گا، تو اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حج سے بے پروا ہونے والا کافر ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ایسے شخص کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

۳۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں پیغمبر صلعم اور مسلمانوں کے لیے تسلی ہے۔ گویا ان سے یوں کہا گیا کہ کفار نے تم کو جوار بیت اللہ سے جلاوطن کیا اور نماز و قربانی سے روکا لیکن اب کہ ہم تم کو کوثر بخشتے ہیں، پورے فراغ خاطر اور ایک بڑی جماعت کے ساتھ اپنا حوصلہ پورا کرو۔" اس سے ایک طرف تو نماز، حج، قربانی اور دوسرے اعمال صالحہ کے لیے اس بے تابی کا اظہار ہو رہا ہے، جو آنحضرت صلعم اور آپؐ کے صحابہؓ کو بے چین کیے ہوئے تھی اور دوسری طرف اس میں بشارت، تسلی اور اظہار محبت کے بھی نہایت جاں نواز پہلو ہیں۔

۴۔ یہ اس عہد کا بیان ہے جس کی ذمہ داری خدا کے عطیہ کے بعد از خود ہم پر عائد ہو جاتی ہے، کیونکہ نماز اور قربانی کے حکم کو خدا نے اپنے عطیہ کے ساتھ گویا مشروط کیا ہے۔ اس وجہ سے جب ہم نے خدا کا عطیہ قبول کر لیا تو لازماً اس حکم کو بھی اپنے اوپر واجب کر لیا۔ اور اس سے یہ بھی نکلا کہ جب تک ہم اس عہد پر قائم رہیں گے یہ عطیہ بھی ہمارے لیے باقی رہے گا۔

یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے جس طرح معاملہ آدم و حوا کے ساتھ ہوا تھا۔ خدا نے ان کو جنت میں سکونت اور ہر چیز سے آزادانہ فائدہ اٹھانے کی اجازت دی لیکن ایک مخصوص درخت کے پاس جانے کی ممانعت کر دی۔ جب انھوں نے خدا کے بخشے ہوئے عطیہ کو قبول کر لیا تو لازماً ان کے اوپر خدا کا یہ عہد بھی خود بخود واجب ہو گیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عہد ہی کے لفظ سے تعبیر فرمایا

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلٰى آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا۔ (طٰہٰ - ۱۱۵)	اور ہم نے اس سے پہلے آدم سے ایک عہد لیا لیکن وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی۔

چنانچہ یہ عطیہ اسی وقت تک باقی رہا جب تک وہ دونوں اپنے عہد پر باقی رہے۔

اسی نوعیت کا معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی پیش آیا۔

وَإِذِ ابْتَلٰى إِبْرٰهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ ۝ (البقرۃ - ۱۲۴)	یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو اس نے وہ پوری کر دیں۔ خدا نے کہا میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا۔ ابراہیم نے پوچھا اور میری ذریت میں سے؛ خدا نے جواب دیا میرا یہ عہد ظالموں سے نہیں ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے فرمائے ہوئے حکموں کی تعمیل کر دی تو خدا نے ان سے ایک عہد باندھا اور فرمایا کہ جب تک ان کی ذریت اس عہد پر قائم رہے گی خدا کا عہد بھی قائم رہے گا۔ اور جو اس کو توڑ دیں گے، وہ اس کی برکتوں سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

۵۔ پانچواں پہلو یہ ہے کہ یہ عہد توحید کا بیان ہے۔ قرآن نے اس عہد کو پوری تشریح کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے دلائل کی تفصیل کی ہے۔ ان دلائل کا عام عنوان یہ ہے کہ وہ پروردگار ہے، اسی نے اپنی نعمتوں سے ہم کو مالامال کیا ہے، اسی نے ہم کو خلعت وجود سے آراستہ کیا اور بہترین ساخت پر پیدا کیا، اور ہمارے لیے رزق طیب کا خوان کرم بچھایا۔ اس وجہ سے اسی کی عبادت اور اسی کی پرستش کرنی چاہیے۔ لیکن یہاں ایک مخصوص عظیم الشان نعمت کا ذکر ہے۔ اس وجہ سے توحید کا مطالبہ بھی اسی مخصوص پہلو سے کیا گیا ہے۔ یعنی رجحان کلام گویا یوں ہے کہ جب خدا ہی نے ہم کو اس گھر کی خدمت و پاسبانی کی عزت بخشی ہے تو نماز و قربانی بھی اسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ اس میں ان مشرکین پر تعریض بھی ہے جو اس عہد کو فراموش کر کے غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت "إِنَّا" (بے شک ہم نے) اور "لِرَبِّكَ" (اپنے خداوند ہی کے لیے) کے الفاظ پر غور کرنے سے سامنے آتی ہے، یعنی ہم ہی نے تم کو بخشا ہے اس وجہ سے تمہارا فرض ہے کہ مشرکین کے برخلاف صرف ہماری ہی نماز پڑھو اور ہمارے ہی لیے قربانی کرو۔ سورہ حج میں یہ مضمون بار بار بیان ہوا ہے۔ یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ محمد بن کعب قرظی نے بھی آیت کی تفسیر یوں ہی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"لوگ غیر اللہ کے لیے نمازیں پڑھتے تھے، اور غیر اللہ کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ جب ہم نے تم کو اے محمد کوثر بخشا تو تمہاری نماز اور قربانی صرف ہمارے ہی لیے ہونی چاہیے۔"

۱۰۔ نماز اور قربانی میں مناسبت

نماز اور قربانی میں بہت سے پہلو ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارے کیے ہیں۔ لیکن یہاں ان سب کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتاب المفرداتؔ[1] میں پوری تفصیل ملے گی۔ اس جگہ ہم ان دونوں کے صرف ان پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے جن سے ان کی باہمی مناسبت واضح ہو۔

ہر چند قرآن نے ان کو تصریح کے ساتھ نہیں بیان کیا ہے، لیکن جو شخص قرآن کی آیات اور ان کے کلمات کے باہمی نظم پر غور کرے گا وہ کسی طرح ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ غور کے لیے اصلی چیز قرآن کے حسن نظم کا یقین ہے اور تعجب ہے کہ جس قرآن میں یہ آیت بھی موجود ہے:

---

[1] مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ (مترجم)

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ (محمد - ۲۴)

کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں۔

اس پر غور و فکر کرنے سے کوئی شخص کیونکر بے پروا ہو سکتا ہے!

اس تمہید سے مقصود یہ ہے کہ یہاں صرف یہ بات کہ خدا نے نماز اور قربانی کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے، ہم کو دعوت دیتی ہے کہ ہم ان دونوں کی باہمی مناسبت پر غور کریں۔ اسی اشارے نے ہمارے سامنے بے شمار حقائق حکمت کی راہ کھولی ہے۔ ہم اس فصل میں ان کو بیان کرتے ہیں تاکہ ایک طرف آیت کا حسن نظم واضح ہو اور دوسری طرف ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکیں کہ قرآن کی جو سورتیں اپنے الفاظ کے اعتبار سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں وہ اپنے معانی کے اعتبار سے بحر بے کراں ہیں۔ ذیل میں ان دونوں کی باہمی مناسبت کے تمام پہلوؤں کی تفصیل کی جاتی ہے۔

۱۔ نماز اور قربانی میں اسی طرح کی مناسبت ہے، جس طرح کی مناسبت ایمان اور اسلام میں ہے۔

یہ اجمال ہے، اس کی تفصیل سے پہلے ایک مختصر تمہید سن لینی چاہیے۔

دین کی بنیاد علم اور عمل کی صحت پر ہے۔ علم یہ ہے کہ ہم اپنے رب کو پہچانیں، اس کے ساتھ اپنے تعلق کو جانیں، اور پھر اس معرفت سے کبھی غافل نہ ہوں، اس علم سے لازماً محبت اور شکر کی ایک قلبی کیفیت و حالت پیدا ہوتی ہے۔ اسی قلبی کیفیت سے اعمال کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح گویا علم و عمل میں وہی تعلق ہے جو اثر اور موثر اور ظاہر اور باطن میں ہوتا ہے یعنی علم ایمان سے تعلق رکھتا ہے اور عمل اسلام سے!

پھر، ایک دوسری حقیقت پر غور کرو! عمل جس طرح علم کا مقابل ہے، اسی طرح قول کا بھی مقابل ہے یعنی قول، علم و عمل کے بیچ کی کڑی ہے۔ قول ارادہ کا اولین ظہور اور عمل کا عنوان و دیباچہ ہے۔ اس تمہید کی روشنی میں اب نماز اور قربانی کے باہمی تعلق پر غور کرو۔

نماز ظاہر ہے کہ قول و اقرار ہے۔ یہ اٹھنا، بیٹھنا، جھکنا، سجدہ کرنا، ہاتھ اٹھانا، انگلی سے اشارہ کرنا کیا ہے، یہ سب اداؤں کی زبان سے ہمارا قول و قرار ہے۔ یہ ایمان کے بعد، راہ اطاعت میں ہمارا پہلا قدم ہے۔ یہ اعمال کے دروازہ کی کلید ہے۔ اسی سبب سے یہ تمام شریعت کے دروازہ کا عنوان قرار دی گئی ہے۔ بہ کثرت آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارات کیے گئے ہیں مثلاً

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ

جو غیب میں ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں

تفسیر سورۂ فاتحہ میں اس پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں اس حقیقت کی پوری تشریح ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اس کی صفت توحید کے ساتھ پہچان لینے کے بعد فرمایا۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (انعام ۷۹)

میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

اس آیت میں جس توجہ الی اللہ کا ذکر ہے نماز اسی توجہ الی اللہ کی عملی تصویر ہے۔ اسی وجہ سے ہماری نمازوں کا عنوان یہی مبارک

کلمہ قرار پایا۔ یہی حقیقت حضرت موسیٰؑ کے قصہ میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو توحید کی معرفت بخشنے کے بعد فرمایا۔

فَلَمَّآ اَتٰهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِیْ (طٰہٰ ۱۱-۱۲-۱۳-۱۴)

پس جب وہ اس کے پاس آیا، ندا آئی، اے موسیٰ! میں تمھارا رب ہوں، پس اپنے جوتے اتار دو۔ تم وادی مقدس طویٰ میں ہو۔ اور میں نے تم کو برگزیدہ کیا، پس جو کچھ وحی کی جائے اس پر کان دھرو۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی عبادت کرو اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔

ایک دوسرے مقام پر ابطال شرک کے بعد فرمایا:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (روم ۳۰-۳۱)

اپنا رخ یکسو ہو کر دین الٰہی کی طرف سیدھا کرو۔ یہی اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس میں فطرتِ الٰہی کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہے۔ یہی فطرت کا سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر، اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو۔ مشرکین میں سے نہ بنو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز تمام مخلوقاتِ الٰہی کی فطرت ہے۔ چنانچہ فرمایا:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل ۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین، اور جو ان میں ہیں، اس کی تسبیح پڑھتے ہیں اور نہیں ہے کوئی شے مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح پڑھتی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ (نور - ۴۱)

نہیں دیکھتے کہ جو آسمان اور زمین میں ہیں سب اللہ کی تسبیح پڑھتے ہیں اور چڑیاں قطار در قطار، ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح سیکھ رکھی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تمام اعمال میں سے نماز، ایمان سے سب سے زیادہ قریب، بلکہ ایمان کا اولین فیضان ہے یہ بیک وقت توحید، انابت، شکر، توکل، اور تبتل الی اللہ ساری چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات کی فطرت ہے۔

اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو! قربانی، حقیقت اسلام کی تصویر ہے۔

اسلام کا مفہوم، اطاعت، سرفگندگی اور نفس کو بالکلیہ مولیٰ کے حوالہ کر دینا ہے، نماز کی طرح یہ بھی بندوں کی فطرت ہے کیونکہ تمام مخلوق امر الٰہی کی اطاعت سے وجود میں آئی ہے۔ خدا نے کلمہ "کن" کے ذریعہ سے حکم دیا اور تمام مخلوق ابتدائے خلقت میں اس کلمہ کی اطاعت سے وجود میں آئی۔ اب اگر وہ خدا کی نافرمانی کرتی ہے تو اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرتی ہے۔ اس

اعتبار سے اسلام تمام کائنات کو محیط ہے۔

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران ۸۳)

آسمان اور زمین میں جو ہیں، سب طوعاً و کرہاً اسی کے سامنے سرنگندہ ہیں اور تم اسی کے پاس سب لوٹائے جاؤ گے۔

یعنی بدء خلقت میں جس طرح تم نے اس کے حکم کی تعمیل کی، اسی طرح آخرت میں اس کے حکم پر دوڑو گے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (روم ۲۵)

جب وہ تم کو زمین سے نکلنے کے لیے ایک بار پکارے گا، تم دفعتہ نکل کھڑے ہوگے۔

دوسری جگہ فرمایا:

فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل ۵۲)

اور تم اس کی حمد کے ساتھ اس کی پکار پر دوڑو گے اور گمان کرو گے کہ نہیں تم ٹھہرے مگر بہت کم۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اور تسبیح و سجدہ اور نماز دونوں عین فطرت اور باہم گر نہایت قریبی رشتہ دار ہیں۔

جب حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے ہمارا امام، ان کی مسجد کو ہمارا قبلہ، اور ان کے طریقہ کو ہمارے لیے دستور العمل بنایا تو ایک واقعہ بیان کر کے ہمارے لیے قربانی کی حقیقت بھی آشکارا کر دی جس سے ضمناً نماز کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا

اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ۔

میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں، وہ میری رہبری فرمائے گا (یعنی میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ مجھ پر اپنی راہ کھولے گا)

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔

اے پروردگار مجھے صالحین میں سے بخش (یعنی اولاد صالح، تاکہ میں ان کو لے کر تیری راہ پر چلوں، اور لوگوں کے لیے حق و ہدایت کی راہ کھلے)

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ۔

پس ہم نے اس کو ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی (یعنی حضرت اسمٰعیل کی۔ اسمٰعیل کے معنیٰ ہیں "اللہ نے سنا" چونکہ ان کی ولادت ابراہیم کی دعا کے مطابق ہوئی تھی، اس وجہ سے ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى۔

جب وہ اس عمر کو پہنچے کہ ان کے ساتھ دوڑ پھر سکیں، انھوں نے کہا: بیٹے میں نے خواب میں یوں دیکھا کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں (یعنی اللہ کے لیے) اب تم بتاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟

(یہ سوال اس لیے تھا کہ اس اطاعت میں فرمانبردار بیٹے کو بھی برابر کا شریک کر لیا جائے، کیونکہ حضرت ابراہیم ہمیشہ کے لیے تسلیم و اطاعت الٰہی کی ایک راہ کھول رہے تھے اور چونکہ اطاعت شعار فرزند دعا ہائے سحر کی قبولیت کے نتیجہ کے طور پر عطا ہوا تھا، اس وجہ سے اس کا عاقل اور حلیم ہونا معلوم تھا۔ یہ اندیشہ نہ تھا کہ اس کو اس امتحان بندگی میں شرکت سے انکار ہوگا)

قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ۔

انھوں نے جواب دیا، والد ماجد! جو حکم ملا ہے، اس کی تعمیل فرمائیے۔ ان شاء اللہ آپ مجھ کو ثابت قدموں میں پائیں گے۔

(حضرت اسمٰعیل سمجھ گئے کہ ان کو حکم الٰہی کی تعمیل میں ذبح کیا جا رہا ہے، اس وجہ سے انھوں نے وہ جواب دیا جو متوکلین کے شایان شان تھا)

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ

پس جب دونوں امر الٰہی کے سامنے جھک گئے اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔

(یعنی اس طرح دونوں نے اپنے کمال اطاعت و اسلام کو آشکارا کر دیا۔ کیونکہ باپ نے اس چیز کو قربان کرنے کا عزم کر لیا جو اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی، اور بیٹے کی تو کل کائنات صرف اس کی جان ہی تھی)

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ۔

اور ہم نے اس کو پکارا، اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ بے شک ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں۔ بلاشبہ کھلی ہوئی جانچ یہی ہے۔

(اس اطاعت کاملہ نے ان کو درجۂ احسان کی سرفرازی بخشی، اور یہی کمال اسلام ہے۔ اس امتحان کے بعد ان دونوں کو خدا نے قوموں کا امام اور ہادیوں کا رہبر بنایا)

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (الصّٰفّٰت ۹۹-۱۰۷)

اور ہم نے اس کو بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا۔

(یعنی اس قربانی کی یادگار میں، قربانی کی ایک عالمگیر اور عظیم الشان سنت قائم کر دی، جو قربانی کرنے والوں کی مغفرت کا وسیلہ ہے)

اس سرگزشت میں خدا نے ہمارے سامنے یہ حقیقت کھولی ہے کہ اسلام کی روح خدا کی اطاعت اور اپنی عزیز سے عزیز متاع حتیٰ کہ جان کو بھی خدا کے حوالہ کر دینا ہے۔ اور یہ بات بغیر کامل ایمان و اخلاص کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ پس گویا ان دونوں کا رتبۂ کمال مقام احسان ہے۔ احسان کی حقیقت یہ ہے کہ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ (اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو) اس سے معلوم ہوا کہ قربانی اور نماز میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایمان و اسلام میں یا قول اور عمل میں ہے، اور احسان ان دونوں کا نقطۂ اتصال ہے۔

۲ ـ دوسرا پہلو یہ ہے کہ نماز اور قربانی میں وہ نسبت ہے، جو نسبت زندگی اور موت میں ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نماز کی حقیقت یادِ الٰہی ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ ۱۴)

اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

دوسری جگہ ہے:

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ ۱۵)

اپنے رب کے نام کو یاد کیا پس نماز پڑھی۔

قرآن مجید میں اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں، اور ذکر سے مقصود دوام ذکر الٰہی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ (آل عمران ۱۹)

جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔

نیز فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (احزاب - ۴۱ تا ۴۳)

اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو، اور صبح و شام اس کی تسبیح پڑھو۔ وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے جائے اور وہ مومنین پر مہربان ہے۔

یعنی جس طرح تم اس کی یاد کرتے ہو، اور اس کی تسبیح پڑھتے ہو، اسی طرح وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں جس سے تمہاری روشنی بڑھتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (بقرہ - ۱۵۲)

پس مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کروں گا۔

نیز فرمایا:

فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ (حم سجدہ - ۳۸)

جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں، وہ رات دن اس کی تسبیح پڑھتے ہیں اور کسی وقت اس سے برداشتہ خاطر نہیں ہوتے۔

یہی راز ہے کہ ہمارے رات دن کے تمام اوقات نمازوں سے گھیر دیے گئے ہیں اور کسی حالت میں بھی اس سے معافی نہیں دی گئی ہے۔ نماز سانس کی طرح زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ حقیقی زندگی جو نور، سکینت اور ایمان کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے، صرف اللہ کی یاد ہی سے باقی رہ سکتی ہے۔ غور کرو تو عقلاً یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کیونکہ بندوں کو عقل و تمیز کی صلاحیت بخش دینے کے بعد خدا کی نظر کرم ان کی طرف اس وقت تک ملتفت نہیں ہونی چاہیے جب تک وہ اپنی توبہ و انابت سے اس کو دعوت نہ دیں۔ اس کا دستور یہ ہے کہ جب بندہ شکر کرتا ہے اور پائی ہوئی نعمتوں کو کام میں لاتا ہے تو وہ نعمت کو زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد - ۱۷)

جو طلب ہدایت میں سرگرم رہتے ہیں ان کے نور ہدایت کو بڑھاتا ہے۔

توجہ الی اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نام کی یاد کی جائے۔ خدا سے تقرب حاصل کرنے کی راہ یہی ہے۔ اللہ سے قربت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کو یاد رکھا جائے اور اس سے دوری کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد سے غفلت ہو جائے (اعاذنا اللہ منہا) جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اس سے قریب ہو جاتا ہے) جیسا کہ فرمایا ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (علق - ۱۹)

سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔

اس وقت اللہ کی نظر رحمت اس کو نوازتی ہے۔ اس کا سینہ انوار و تجلیات الٰہی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ اور اس کی روح ذکر و فکر کی گہرائیوں میں جس قدر اترتی جاتی ہے، زندگی اور قوت کے لازوال خزانوں سے اسی قدر قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں اسی حقیقت کی خبر دی گئی ہے۔

ما یزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی احببته فاذا احببته کنت سمعه الذی به یسمع وبصره الذی به یبصر ویده التی بها یبطش۔

بندہ نوافل کی راہ سے میری طرف بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں۔ اور جب میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں، تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔

یہ اسی روحانی زندگی کا بیان ہے، جو حقیقی اور واقعی زندگی ہے

اس سے معلوم ہوا کہ نماز حقیقی زندگی کا سرچشمہ اور اس حیات سفلی سے نجات حاصل کرنے کا زینہ ہے۔

اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو! اس کا اصلی مفہوم جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی سرگزشت سے ظاہر ہے نفس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا ہے۔ یہ تسلیم و اطاعت کے ایک عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے اور اس میں اس زبردست امتحان کی سرگزشت پنہاں ہے جس میں خدا نے ابراہیمؑ خلیل کو ڈالا تھا۔ اہل ایمان، راہِ الٰہی میں اپنی جانیں قربان کر کے، اسی اطاعت و عبدیت کی یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ پس جس طرح نماز اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے اسی طرح قربانی اس کی راہ میں ہماری موت ہے۔ اور یہی حقیقی دین اور حقیقی اسلام ہے۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (انعام ۱۶۱ - ۱۶۲)

کہہ دو میرے رب نے مجھ کو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ سیدھے دین، دین ابراہیم کی، جو صرف اللہ کا پرستار تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ کہہ دو میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العلمین کے لیے ہے۔

باتفاق تمام مفسرین اس آیت میں "نسک" سے مراد حج اور عمرہ میں قربانی کرنا ہے۔ لغت عرب سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، یہاں "صلوٰۃ" اور "نسک" کو ایک ساتھ رکھا ہے اور اس کے بعد علی الترتیب "محیا" اور "ممات" کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ نظم کلام، توافق کے اصول پر، ان دونوں کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کو بے نقاب کر رہا ہے۔ یعنی نماز مسلم کی زندگی ہے اور اس کی قربانی راہِ الٰہی میں اس کی موت ہے۔ پھر غور کرو تو یہ دونوں بالکل ایک ہیں، کیونکہ یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ (بقرہ ۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔

۲۔ نماز اور قربانی "حقیقی قربانی" کے دو بازو ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو صاحب عقل و ارادہ اور خیر و شر میں تمیز کرنے والا بنایا، تو ایک طرف تو اس کو عظمت و رفعت کا وہ مقام بلند بخش دیا جس سے برتر اور بلند کوئی اور مقام نہ تھا۔ دوسری طرف اس کو ذلت و پستی کے اس کنارہ پر کھڑا کر دیا جس سے بڑھ کر کوئی ذلت و پستی نہ تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (تین ۴ - ۵ - ۶)

بے شک ہم نے آدمی کی ساخت اچھی سے اچھی بنائی، پھر ہم نے اسے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا، مگر جو کہ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں، سو انھیں ہمیشہ کے لیے انعام ملے گا۔

نیز فرمایا:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (شمس ۷ - ۸ - ۹ - ۱۰)

اور شاہد ہے نفس اور اس کی تشکیل، چنانچہ اس کو اس کی بدی اور نیکی الہام کی جس نے اس کو سنوارا، اس نے فلاح پائی۔ جس نے اس کو خاک میں ملایا وہ نامراد ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ جب اس منعم حقیقی سے بے پروا ہو جاتا ہے تو جمالِ الٰہی کی روشنی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور وہ باطل کے دام فریب میں پھنس کر اپنے آپ کو ہوائے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ھَوٰہُ وَاَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ (جاثیہ - ۲۳)

کیا وہ جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا لیا ہے اور خدا نے اس کو علم دینے کے باوجود گمراہ کر دیا ہے۔

یعنی اس نے عقل اور آنکھ کان سب کچھ پاکر گمراہی کی راہ اختیار کر لی ہے، جیسا کہ سورۂ دہر میں ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَۃٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْہِ فَجَعَلْنٰہُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا۔ (دہر ۲-۳)

ہم نے آدمی کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، اس کو مختلف اطوار میں الٹتے پلٹتے رہے، پھر اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اس کو راہ سوجھا دی ہے۔ چاہے وہ شکرگزار بنے یا ناشکری کی راہ اختیار کرے (یعنی اگر وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو کام میں نہ لائے گا تو ناشکری کی راہ اختیار کرے گا)

وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ (جاثیہ - ۲۳)

اور اس کے کان، اور دل پر مہر کر دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے۔ پس اللہ کے بعد اس کو کون ہدایت کی راہ دکھائے گا۔ تم لوگ سوچتے نہیں۔

یعنی جب اس نے خدا سے منہ پھیر لیا، اور اپنے نفس کا غلام بن گیا تو خدا نے اس کو اس کی خواہشوں کے حوالے کر دیا، جو اس کے قلب کے لیے حجاب بن گئی ہیں۔

کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔ کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۔ (مطففین ۱۴-۱۵)

ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی جم گئی ہے، ہرگز نہیں! وہ اس دن اپنے پروردگار کے دیدارِ جمال سے محروم ہوں گے۔

یعنی جس طرح وہ اس حیات دنیوی میں خدا کے نورِ ایمان سے محروم تھے، اسی طرح حیات اخروی میں اس کے دیدارِ جمال سے محروم ہوں گے۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے خدا کی طرف سے وہی اس کو ملتا ہے۔ جنھوں نے نفس اور شہواتِ نفس کی غلامی پسند کی، وہ نفس کے غلام بن گئے، اور قیامت کے دن اپنے نفس کی حقیقت سے دوچار ہوں گے جس کا بیان یوں کیا گیا ہے کہ ثُمَّ اِنَّھُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ۔ (پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے)

اس حالت کی وجہ سے انسان کے لیے ضروری ہوا کہ وہ نفس کے صنم اکبر کو توڑے۔ اور نفس کی حقیقت پر جن لوگوں نے غور کیا ہے، ان کو معلوم ہے کہ نفس کے دو بازو ہیں۔ سبعیت اور بہیمیت۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ انسان کو ان دونوں بازوؤں کے توڑنے کی تدبیر بتائی جائے۔ اب ان [illegible]وں کی تفصیلات پر غور کرو۔

۱۔ اول یعنی سبعیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ اللہ کے حضور خشیت و تذلل کے ساتھ نماز کی پابندی کی جائے۔ نفس کے کبر و نخوت کا سر صرف نماز ہی سے کچلا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خشوع نماز کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے چنانچہ اسی وجہ سے فرمایا گیا ہے،

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خٰشِعُوْنَ (مومنون - ۱-۲)

بے شک ان ایمان والوں نے فلاح پائی، جو اپنی نمازوں میں خدا کے سامنے سرنگندہ ہیں۔

نیز فرمایا ہے:

وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِیْ نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیُسَبِّحُوْنَہٗ وَلَہٗ یَسْجُدُوْنَ (اعراف ۲۰۵-۲۰۶)

اپنے رب کو دل میں یاد کرو، گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور پست آواز میں صبح اور شام، اور بے خبروں میں سے مت بنو، جو لوگ تمہارے رب کے پاس ہیں وہ اس کی بندگی سے اباء نہیں کرتے، اور اس کی تسبیح کرتے ہیں، اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (فرقان ۶۳-۶۴)

اور خدائے رحمٰن کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر خاکساری کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام! اور جو اپنی راتیں خدا کے حضور سجدہ و قیام میں بسر کرتے ہیں۔

اس آیت پر غور کرو۔ اس میں نماز سے پہلے ان کی خاکساری کا تذکرہ کیا ہے کیونکہ نماز کی حقیقت نفس کو نخوت سے پاک کرنا ہے جو لوگ برابر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں اور خدا کے جلال و جبروت اور اس کی نعمت و رحمت کی یاد تازہ رکھتے ہیں، ان کے چہروں سے تواضع اور محبت کا جمال ٹپکتا رہتا ہے۔ اسی قسم کا نظم اس آیت میں ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا (فتح - ۲۹)

محمد اللہ کا رسول۔ اور جو اس کے ساتھ ہیں، کافروں پر سخت ہیں، آپس میں نرم دل ہیں، تم ان کو دیکھو گے رکوع اور سجدہ میں۔

یہاں رہبانیت کی تردید کی غرض سے پہلے "شدت" کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ جو خدا سے محبت کرتا ہے اس کا دل اس مقام کی بے پایاں عظمتوں کے احساس سے اس قدر لبریز ہو جاتا ہے کہ اس میں دوسروں کی عظمت اور بڑائی کے خیال کی سمائی سرے سے رہ ہی نہیں جاتی اس وجہ سے وہ تمام مخالفتوں سے نڈر ہو کر علی الاعلان اس کی شہادت دیتا ہے۔ پس اس جگہ "شدت" کا ذکر محض ایک وہم کے دور کرنے کے لیے ہے، کیونکہ تذکرہ ایک ایسی امت کا ہو رہا تھا جو اعتدال کے نقطۂ کمال پر ہے۔ آیت میں مسلمانوں کی وہ صفت بیان ہوئی ہیں، جو تورات و انجیل میں مذکور ہیں، اور جو ان کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی امتوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ضمناً اس میں کمال عدل و اعتدال اور جمع بین الضدین کی اس فضیلت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا، جو امت مرحومہ کی خاص خصوصیات میں سے ہے اور جس کے بعد فضیلت کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ پس اس جگہ "شدت" کے ذکر سے محض اس صفت تواضع و رحمت کی تصحیح مقصود ہے، جس کا سرچشمہ خشیت الٰہی ہے، کیونکہ خدا کی خشیت تمام خوفوں سے بے نیاز کر کے آدمی کو حق کے مخالفین کے

لیے بالکل بے لچک بنا دیتی ہے۔

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ (آل عمران ۵، ۱) — پس ان سے مت ڈرو۔ صرف مجھ سے ڈرو۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (مائدہ ۳) — پس ان سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو۔

اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں۔

۲۔ دوسرے بازو یعنی بہیمیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ نفس اس دنیا کی جن مرغوبات میں لذت پاتا ہے ان سے اس کو علیحدہ کیا جائے۔ اس کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان قربان کی جائے۔ اس کا بلند ترین مقام لختِ جگر کی قربانی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی قربانی کے حکم سے جانچا گیا، جو ان کی محبوب ترین اولاد تھے۔ ان کے محبوب ترین ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب فرشتہ نے حضرت اسحاق کی ولادت کی خوش خبری دی تو انھوں نے کہا "اسمٰعیل زندہ رہے" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو حضرت اسماعیل کے ساتھ کس قدر والہانہ محبت تھی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اطاعتِ الٰہی کی راہ میں مصائب و آلام جھیلے جائیں، اور لذات سے کنارہ کشی اختیار کی جائے کیونکہ زندگی کے بعد نفس کو سب سے زیادہ محبوب لذات ہی ہیں۔ روزہ اس منزل میں بہترین رہبر ہے۔ مقام قربانی کے مدارج میں سے ضعفاء طریق کی پہنچ اسی حد تک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ سب سے بلند درجہ کے حصول کی راہ کیا ہے تو انھوں نے فرمایا یہ روزہ اور نماز سے حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ مال کو، جو تمام لذات کے حصول کا ذریعہ ہے، خدا کے راستہ میں خرچ کیا جائے۔ اس منزل میں رہبر زکوٰۃ ہے۔ متعینہ زکوٰۃ سے زیادہ خرچ کرنے میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو چیز غرور کا سبب ہوتی ہے آدمی اس کو خدا کی راہ میں لٹا دیتا ہے۔ پھر چونکہ مقصود ذبح بہیمیت سے نفس کو ان چیزوں کی غلامی سے چھڑانا ہے جن کی لذتیں اس پر گھیرے ڈال رہی ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ خدا کی راہ میں وہ چیز خرچ کی جائے جو نفس کو محبوب ہو چنانچہ اسی سبب سے فرمایا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران) — تم اس وقت تک وفاداری کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو، جو تمھیں محبوب ہیں۔

یہ جو قربانی کے جانوروں کو قربان کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں بھی یہی حکمت ہے اور حضرت ابراہیم کو محبوب ترین اولاد کے ذبح کا حکم دے کر تو یہ حقیقت بالکل ہی آشکارا کر دی گئی ہے۔ نیز چونکہ قربانی کا حقیقی مرتبہ کمال جان کی قربانی تھا، اس وجہ سے خون بہانا، اس کی اصل علامت قرار پایا۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی کہ نماز اور قربانی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ذبح نفس کے دو پہلو ہیں، ایک حدیث میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

قربان هذه الامة بذل مائها وصلوٰتها — اس امت کی قربانی، بذل نفس اور نماز کے ذریعہ سے ہے۔

۴۔ نماز اور قربانی دونوں ایک دوسرے پر مشتمل ہیں۔ یعنی نماز ایک پہلو سے قربانی ہے، اور قربانی ایک دوسرے پہلو سے نماز ہے۔ نماز کا قربانی ہونا واضح ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ نماز سبعیت کے ذبح کی ایک تدبیر ہے۔ نیز نفس کو مصائب کی برداشت

اور لذتوں کے ترک کا خوگر بناتی ہے، جو بہیمیت کا ذبح ہے۔ اس وجہ سے اس کی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ قربانی کا نماز ہونا محتاج تفصیل ہے اور یہاں ہم اس پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہ بات گزر چکی ہے کہ قربانی کی حقیقت، راہِ الٰہی میں جان کی قربانی ہے، اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسری صورت میں بعینہٖ نماز ہے۔ نماز میں زبان اور اداؤں کے ذریعہ سے ایمان کا اقرار کیا جاتا ہے اور قربانی میں اسی ایمان کی تصدیق جان دے کر کی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے خدا کی راہ میں جان دینے کا نام شہادت ہوا۔ نیز قربانی میں کمال درجہ خضوع اور اطاعت ہے۔ اس وجہ سے یہ نماز کی اصلی روح۔ اقرار توحید اور خضوع۔ کی یہ سب سے زیادہ حامل ہے۔ علاوہ ازیں اس کے تمام آداب بھی اس کے نماز ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً

ا۔ قربانی خانہ کعبہ کے پاس ہوتی ہے، جو مرکز نماز ہے۔

ب۔ اس کا آغاز بسم اللہ واللہ اکبر سے ہوتا ہے۔

ج۔ قربانی اور قربانی کرنے والے دونوں کا رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔

د۔ اونٹوں کو کھڑے کر کے قربان کیا جاتا ہے، جس میں قیام نماز کی جھلک پائی جاتی ہے۔

ھ۔ مینڈھوں کو لٹا کر قربان کیا جاتا ہے جس کو سجدۂ نماز سے مشابہت ہے۔

پھر آغاز نماز کی دعا جو قرآن میں وارد ہے، یہ ہے اور یہی دعا قربانی کے وقت بھی پڑھی جاتی ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (انعام - ۷۹) — میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

نیز

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ (انعام ۱۶۲ - ۱۶۳) — بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔ چنانچہ ابراہیم کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ۔ (صفت - ۱۰۳) — جب ان دونوں نے امر الٰہی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔

یعنی ان کے ظاہر و باطن دونوں خدا کی طرف متوجہ ہو گئے، اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو سجدہ میں ڈال دیا۔

اسی طرح قربانی کے ذکر میں فرمایا۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَکُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَکُمْ فِیْهَا خَیْرٌ فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ (حج - ۳۵) — اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمھارے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا۔ ان میں تمھارے لیے فوائد ہیں۔ پس ان پر اس حال میں کہ وہ صف بصف ہوں۔ اللہ کا نام لو۔

یعنی جس طرح تم نمازوں میں صف بستہ کھڑے ہوتے ہو، اسی طرح وہ بھی ذبح کے وقت قطار میں کھڑے کیے جائیں۔

اسی طرح زکوٰۃ کے بیان میں، جو قربانی ہی کے ذیل کی عبادت ہے، فرمایا ہے:

وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ

اور وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، درآنحالیکہ جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔

یعنی زکوٰۃ دیتے وقت ان کی ہیئت سے خشوع کا اظہار ہوتا ہے، وہ متکبر اور طالب شہرت اغنیاء کی طرح تن کر زکوٰۃ نہیں دیتے۔

۵۔ نماز اور قربانی دونوں ذکرِ الٰہی ہیں۔ نماز کا ذکر ہونا تو متعدد آیات سے واضح ہے۔ مثلاً

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي (طٰہٰ-۱۴)

اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ (اعلیٰ-۱۵)

اور اس نے اپنے رب کے نام کو یاد کیا، پس نماز پڑھی۔

رہا قربانی کا ذکر ہونا تو یہ بھی قرآن سے ثابت ہے۔ فرمایا:

لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (حج-۳۴)

تاکہ اللہ کے نام کو یاد کریں، ان چوپایوں پر جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔

كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (حج-۳۷)

اسی طرح ان کو تمہارے لیے مسخر کیا تاکہ تم اس ہدایت پر جو اللہ نے تم کو بخشی ہے، اس کی بڑائی کرو (یعنی دینِ توحید اور اسلام کے دیے جانے پر)

اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح تکبیر کے ذریعہ سے ہم نماز میں اللہ کی بڑائی بیان کرتے ہیں بعینہٖ اسی طرح قربانی کے وقت بھی کرتے ہیں۔

۶۔ یہ دونوں (نماز اور قربانی) شکر ہیں۔ نماز کا شکر ہونا تو بالکل ظاہر ہے، یہاں تک کہ بعض جگہ نماز کو تعبیر ہی شکر کے لفظ سے کر دیا گیا ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (بقرہ-۱۵۲)

پس مجھ کو یاد رکھو، میں تم کو یاد رکھوں گا، اور میرا شکر کرتے رہو ناشکری مت کرنا۔

سورۂ فاتحہ نماز کی جان ہے، اور معلوم ہے کہ اس سورہ کی بنیاد شکر ہی پر ہے۔

اب قربانی پر غور کرو۔ یہ بات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور دنیا والوں سے بالکل مستغنی ہے۔ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ (وہ کھلاتا ہے لیکن کھاتا نہیں) اس نے جو نعمتیں ہم کو بخشی ہیں، ان میں سے کچھ ہم اس کی راہ میں محض اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے قربان کرتے ہیں، کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے، سب اسی کی ملکیت اور اسی کا انعام ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے قربانی کے وقت ہم یہ الفاظ کہتے ہیں۔

مِنْكَ وَلَكَ

تیری ہی بخشی ہوئی نعمت اور تیری ہی راہ میں۔

اسی وجہ سے فرمایا ہے:

كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (حج-۳۶)

اسی طرح ہم نے ان کو مسخر کیا، تاکہ تم شکر کرو۔

اور جس طرح نماز اللہ کی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں پر ایک عام شکر ہے اسی طرح قربانی بھی محض منافع دنیاوی کا شکر نہیں ہے بلکہ عمومی شکر کا وہی پہلو اس میں بھی ملحوظ ہے جو نماز میں ملحوظ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (حج-۳۷)

تاکہ تم کو جو ہدایت بخشی ہے، اس پر اللہ کی بڑائی کرو۔

۷۔ یہ دونوں تقویٰ کی فرع ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ جس سے آدمی کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں، یا جس سے وہ ڈرتا ہے، اس کو برابر یاد رکھتا ہے۔ نماز اسی ذکر کے قائم رکھنے کے لیے ہے۔ چونکہ بندہ کو خدا کی رضا مطلوب ہوتی ہے اور وہ اس کے غضب سے ڈرتا ہے، اس وجہ سے وہ اس کے سامنے روتا اور گڑگڑاتا ہے۔ آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاتَّقُوهُ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (انعام-۷۲)

اور یہ کہ نماز قائم کرو، اور اس سے ڈرو، اور وہی ہے جس کے پاس تم جمع کیے جاؤ گے۔

اب قربانی کو دیکھو۔ اللہ تعالیٰ نے چوپایوں پر انسان کو جو غلبہ اور تسلط دیا ہے، اس میں ایک قسم کی آقائی اور بندگی کی نمود ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اظہارِ خشوع اور اقرارِ بندگی کے ذریعہ سے اس غرور کو مٹا دیا جائے اور قربانی کے وقت بندہ کی زبان پر شکر نعمت اور اقرارِ عبدیت کے ایسے الفاظ جاری کیے جائیں جن سے خدا کی ملکیت اور پروردگاری اور اس کی وحدت و یکتائی کا اظہار ہو۔

غور کرو ان تمام باتوں میں تقویٰ کی کس قدر جلوہ گری ہے۔ چنانچہ تقویٰ ہی چونکہ ان تمام حقائق کا جامع تھا۔ اس وجہ سے وہی قربانی کی حقیقت قرار پایا۔ بندہ تقویٰ ہی کی راہ سے قربِ الٰہی کے مرتبہ کو پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے کوئی قربانی اس وقت تک قبول نہیں ہوتی، جب تک اس میں تقویٰ نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا۔

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (مائدہ-۲۷)

اللہ صرف متقین کی قربانی قبول کرتا ہے۔

سورۂ بقرہ میں ہے:

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ (بقرہ-۱۹۷)

اور تقویٰ کا زادِ راہ لو، کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہی ہے۔

تقویٰ کو زادِ راہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، کیونکہ یہی چیز قربِ الٰہی کی منزلوں تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ یہ تقریب دراصل تقرب کے لیے ہے، جیسا کہ گیارھویں سبب میں ہم لکھیں گے، اس وجہ سے اس میں تقویٰ کا زادِ راہ ناگزیر ہوا۔

۸۔ یہ دونوں منازلِ آخرت میں سے ہیں۔ کیونکہ نماز رجوع الی اللہ اور حشر میں پروردگار کے حضور ہمارے کھڑے ہونے کی تصویر ہے۔ اسی وجہ سے اس میں معاد کی ایک جھلک پائی جاتی ہے، گویا بندہ جس وقت نماز میں کھڑا ہوتا ہے اس وقت وہ خدا کے سامنے اپنی حاضری کے دن کو یاد کر رہا ہوتا ہے۔ یہ اشارہ مندرجہ ذیل آیت سے نکلتا ہے۔

إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (بقرہ-۴۵-۴۶)

بے شک وہ (نماز) گراں ہے، مگر ان خوف رکھنے والوں پر جن کو گمان ہے کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور ایک دن وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

جن لوگوں کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ایک دن خدا کی طرف لوٹنا اور اپنے تمام اعمال و اقوال کی جواب دہی کرنی ہے، وہ تمام غفلتوں اور گناہوں سے تائب ہو کر لازماً اللہ کی طرف جھک جاتے ہیں، اور جو خشیت اور پستی خدا کے سامنے آخرت میں ان پر طاری ہونے والی ہے، اس کا عکس دنیا ہی میں ان پر نظر آنے لگتا ہے، مندرجہ ذیل آیات پر غور کرو۔

قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (نازعات-۸)

دل اس دن مضطرب ہوں گے اور نگاہیں پست ہوں گی۔

قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون (مومنون ۱-۲)

ان ایمان والوں نے فلاح پائی، جو اپنی نمازوں میں سرنگندہ ہیں۔

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوۃ وایتاء الزکوۃ یخافون یوما تتقلب فیہ القلوب والابصار (نور-۳۷)

ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی۔ وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گے۔

یہ آیت بھی اسی کے مشابہ ہے:

ان الانسان لیطغی ان راہ استغنی ان الی ربک الرجعی ارءیت الذی ینھی عبدا اذا صلی۔ (علق - ۶ تا ۱۰)

بیشک انسان سرکشی کرتا ہے، اس وجہ سے کہ وہ اپنے کو مستغنی دیکھتا ہے۔ بیشک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے (یعنی جس کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے وہ کیسے بے پرواہ ہوتا ہے) تم نے اس کو دیکھا! جو ایک بندہ کو روکتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ خدا حشر کے دن، جب ہم کو پکارے گا تو ہم اس کی حمد پڑھتے ہوئے قبروں سے نکل کر اس کی طرف بھاگیں گے۔

یوم یدعوکم فتستجیبون بحمدہ وتظنون ان لبثتم الا قلیلا (اسراء ۵۲)

جس دن وہ تم کو پکارے گا تو تم اس کی حمد پڑھتے ہوئے اس کی طرف دوڑو گے۔ اور خیال کرو گے کہ تم بہت کم ٹھیرے۔

اسی طرح نمازی نماز کی پکار کی طرف لپکتے ہیں اور صف بستہ ہو کر خدا کی حمد کرتے ہیں۔

بعینہٖ یہی حقیقت قربانی میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہ بھی نماز کی طرح رجوع الی اللہ ہے، جیسا کہ دوسرے اور تیسرے سبب کے بیان میں مذکور ہو چکا ہے۔ یہاں اس پر ہم ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالیں گے۔

جس طرح چوپایوں کو خدا نے ہمارے لیے مسخر کیا ہے، اسی طرح ہمارے جسموں کو بھی ہمارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ ایک معین مدت تک کے لیے نرمی اور حسنِ سلوک کے ساتھ ہم ان کو اپنا مرکب بنائیں۔ اور پھر ان کو خدا کے حوالہ کر دیں۔ چوپایوں کے بارہ میں فرمایا ہے:

لکم فیھا منافع الی اجل مسمی ثم محلھا الی البیت العتیق۔ (الحج - ۳۳)

تمھارے لیے ایک متعین مدت تک کے لیے ان میں منفعتیں ہیں، پھر ان کو خدا کے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔

جس طرح قربانی کے جانوروں کو ہم بیت اللہ کی طرف لے جاتے ہیں، اسی طرح اپنے اجسام کو بھی لے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے،

واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق (حج ۲۷)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، کہ آویں تمھارے پاس پیادہ پا اور لاغر اونٹوں پر جو آئیں گے گہرے راستوں سے۔

دیکھو! ہمارے جسموں اور ہمارے چوپایوں کے لیے سمت سفر ایک ہی معین ہوتی۔ اور یہ اشتراک ہر چیز میں نمایاں ہے۔ جس طرح قربانی کے جانوروں کا ہم احترام کرتے ہیں، اور ان کے لیے ایک مخصوص شعار قرار دیتے ہیں، بعینہٖ وہی معاملہ ہم اپنے جسموں کے ساتھ کرتے ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ ہم جانوروں کی طرح اپنے جسموں کو ذبح نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت

اسمٰعیلؑ کی جان اس چیز کے عوض چھڑا لی گئی، جو ان کی قائم مقام بن کر قربان ہوئی۔ اسی طرح ہم جانوروں کے فدیہ کے عوض اپنی جانوں کو چھڑا لیتے ہیں۔ لیکن جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیلؑ کا ہدیہ ایک دوسری شکل میں قبول فرمایا کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے گھر کی خدمت کے لیے مخصوص فرما لیا، اسی طرح ہم بھی اپنی جانوں کو فدیہ دے کر چھڑا تو لیتے ہیں لیکن وہ ہم کو واپس نہیں کر دی جاتی ہیں، بلکہ وہ ہماری امانت میں دے دی جاتی ہیں تاکہ جب ضرورت پیش آئے ہم اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر سکیں۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون وعدا علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل والقرآن ومن اوفی بعھدہ من اللہ فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ وذلک ھو الفوز العظیم (توبہ ۱۱۱)

بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کا مال جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور شہید ہوتے ہیں۔ یہ ایک سچا اور پکا عہد ہے اور توراۃ، انجیل، قرآن سب میں مذکور ہے۔ جنھوں نے اللہ سے اپنے عہد کو پورا کیا، ان کے لیے ہمارا پیام یہ ہے کہ اپنے اس معاملہ کے سبب سے جو تم نے کیا ہے خوشخبری حاصل کرو۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

پیروی اسلام کا عہد کر لینے کے بعد ہم خدا کے ہاتھ بک جاتے ہیں، اور اسی عہد کی تجدید کے لیے ہم اس کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں اور حجر اسود کو ہاتھ لگا کر اس عہد کو از سر نو تازہ کرتے ہیں۔ یہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے عہد کی ہماری طرف سے توثیق اور اللہ کی راہ میں قربان ہونے کے لیے ہماری طرف سے اقرار ہوتا ہے۔

پھر حج کا اجتماع میدان حشر میں ہمارے کھڑے ہونے کی بھی تصویر ہے۔ اس پہلو سے نماز، حج اور قربانی، ان تینوں کو معاد سے نہایت قریبی نسبت ہوئی۔

۹۔ یہ دونوں ابواب صبر میں سے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے وعدہ پر پورا بھروسہ کر کے نماز کی پابندی کرتا ہے، اس کی مثال اس درخت لگانے والے کی ہے، جو شب و روز اپنے لگائے ہوئے پودے کی نگہداشت کرتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے، اس کو پانی دیتا ہے، اور اس کے پھل لانے کا منتظر ہے اور دوسروں کی غفلت و سرمستی، اس کی اس سرگرمی و خود فراموشی میں کوئی کمزوری نہیں پیدا کرتی۔ لوگ اس کی امید موہوم پر ہنستے ہیں لیکن وہ خدا کی شکر گزاری اور اطاعت کے جس جادۂ مستقیم پر چل رہا ہے برابر اس پر سرگرم سفر ہے اور لوگوں کے ہنسنے اور مذاق اڑانے سے اس کی ہمت پست نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے یہ باتیں اس وقت تک نہیں ہو سکتیں جب تک آدمی میں ارادہ کی غیر معمولی پختگی اور انجام کار کی کامیابی کا غیر متزلزل یقین نہ ہو۔ چنانچہ اسی وجہ سے قرآن مجید نے صبر اور نماز کو متعدد آیات میں ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ واستعینوا بالصبر والصلوۃ (اور صبر و نماز کے ذریعہ مدد چاہو)

اوپر ہم نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے، مندرجہ ذیل آیت میں ان کی طرف نہایت واضح اشارات ہیں۔

فاصبر علی ما یقولون وسبح بحمد ربک

پس ان کی باتوں پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد کی تسبیح پڑھو،

قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طٰہٰ - ۱۳۰ تا ۱۳۲)

سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے وقتوں میں اس کی تسبیح پڑھو۔ اور دن کے اطراف میں تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔ اور تم نہ دیکھو اس زینت دنیا کی طرف جو ہم نے ان کی بعض جماعتوں کو دے رکھی ہے، تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے ان کا امتحان لیں۔ تمہارے رب کی روزی زیادہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت قدم رہو ہم تم سے روزی نہیں مانگتے، ہم تم کو روزی دیں گے اور انجام کار کی کامیابی تقویٰ کے لیے ہے۔

دوسری جگہ ہے:

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ - (رعد - ۲۲)

اور جو اپنے رب کی رضا کی طلب میں ثابت قدم رہے اور نماز قائم کی۔

نیز فرمایا:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (غافر ۵۵-۵۶)

پس ثابت قدم رہو، بیشک اللہ کا وعدہ حق ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کی تسبیح پڑھو بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارہ میں، بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، جھگڑتے ہیں ان کے سینوں میں محض ایک گھمنڈ ہے جو پورا نہ ہوگا، پس اللہ کی پناہ ڈھونڈو، وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ کے عہد پر قائم رہنا، اس پر پورا بھروسہ کرنا، اس کی راہ میں مصائب جھیلنا اور انجام کار کی کامیابی کا منتظر رہنا کتنی کٹھن راہ ہے اور اس میں ہر قدم پر صبر و ثبات کی کتنی ضرورت پیش آتی ہے۔

یہی حال قربانی کا بھی ہے۔ یہ اس عظیم الشان صبر کی تعلیم پر مبنی ہے جس کا نمونہ ابراہیم خلیل نے پیش کیا۔ بڑھاپے تک خدا نے ان کو کوئی اولاد نہیں بخشی، لیکن حب بخشی اور ایسی اولاد بخشی جس کے حسن باطن اور حسن ظاہر نے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا، تو اسی اولاد کو خدا نے اپنی راہ میں قربان کرنے کا حکم دے دیا۔ غور کرو، کتنا کٹھن امتحان تھا! لیکن حضرت ابراہیم کے پائے ثبات کو ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی، بلکہ وہ خدا کے شکر گزار ہوئے کہ اس نے ان سے وہ چیز مانگی جو ان کو تمام دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز پر ہمارا صبر، اسی طرح کا صبر ہے جس طرح کا صبر ہم مصائب کو برداشت کرتے وقت کرتے ہیں۔ نماز اور خدا کی جانی و مالی آزمائشوں کے وقت صبر میں جو تعلق ہے اس کو آیت ذیل بے نقاب کر رہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ

اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد چاہو، بے شک

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ (بقرہ ۱۵۳-۱۵۸)

اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔ ہم تم کو کسی قدر خوف، قحط اور مال، اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے، اور ثابت قدموں کو بشارت دو۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں: ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے برکتیں اور رحمت ہے اور وہی لوگ راہ یاب ہیں۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں، پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کا طواف کرے اور جس نے اپنی خوشی سے نیکی کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت میں مروہ کا بھی تذکرہ ہے اور ہم اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مفصل لکھ چکے ہیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی قربانی کی تھی۔ غور کرو اس آیت میں نماز، صبر، جہاد، مصائب اور مقام قربانی کا تذکرہ ایک ساتھ ہوا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس وجہ سے کہ ایک جامع حقیقت نے ان سب کا رشتہ ایک ساتھ جوڑ دیا ہے۔

۱۰- ان دونوں میں اس امر کا اقرار و اعتراف ہے کہ ہر چیز خدا ہی کی ملکیت ہے، اور تمام نعمتیں اسی کی بخشی ہوئی ہیں۔ نماز میں تو یہ حقیقت بالکل ظاہر ہی ہے اس کی بنیاد ہی شکر اور اقرار ربوبیت پر ہے۔ غور کرنے سے یہی بات قربانی میں بھی معلوم ہوتی ہے، یہ بھی زبان حال سے گویا اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ ہم قربانی کر کے گویا اقرار کرتے ہیں کہ ہر چیز خدا ہی کی ملکیت ہے، تمام نعمتیں اسی کی بخشی ہوئی ہیں، ہماری جانیں اور ہمارے مال سب اللہ کے خزانۂ جود و فیض ہی سے ہم کو نصیب ہوئے، اس وجہ سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو خدا ہی کے حوالہ کریں اور اسی کی اطاعت و بندگی کی راہ میں ان کو استعمال کریں۔ یہ ہم کو اسی لیے بخشے گئے ہیں کہ ہم اس کے فضل و احسان کا شکر ادا کریں اور جہاں اس کی مرضی ہو وہاں ان کو قربان کر دیں۔ اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے، اس وجہ سے ہم صرف اسی کی بندگی کرتے ہیں اور اسی کے حضور سجدے کرتے ہیں اور جو کچھ اس کا بخشا ہوا ہے اسی کے دربار میں پیش کرتے ہیں۔ وہی پیدا کرنے والا اور وہی بخشنے والا ہے۔ اسی نے ہماری زبانوں پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کا اقرار جاری کیا۔ یعنی ہم اور ہماری تمام ملکیت خدا ہی کے لیے ہیں۔ حکومت اور احسان صرف اسی کی صفت ہے، ہمارے لیے صرف اطاعت اور شکر گزاری ہے۔ جس طرح ملکیت صرف مالک کی طرف لوٹتی ہے، اسی طرح ہم کو بالآخر خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے کسی چیز سے بھی یہاں تک کہ اپنے نفس سے بھی متمتع ہونا اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک ہم اس کا نام لے کر، اس کی بخشش کا اقرار نہ کر لیں۔ اسی چیز کی تعلیم کے لیے اس نے ہمارے لیے قربانی کا فریضہ ٹھہرایا،

تاکہ جو انعام و بہائم اس نے ہمارے لیے مسخر کیے ہیں ہم ان کو اس کے نام پر قربان کریں۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (حج ۳۴)

اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی قرار دی تاکہ جو چوپائے ان کو روزی کیے ہیں، ان کو اللہ کے نام پر قربان کریں۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (حج - ۳۷)

اسی طرح خدا نے ان کو تمھارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ اس نے تم کو جو ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو۔

حیوانات پر انسان کو خدا نے جو اختیار و تصرف بخشا ہے اس میں، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، آقائی اور بندگی کی شان پیدا ہوگئی ہے۔ اس وجہ سے ان کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا ضروری کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح زمین کی پیداوار میں بھی اس نے اپنا ایک حق رکھا ہے تاکہ ہم یہ بات بھول نہ جائیں کہ یہ خدا ہی کی بخشش سے ہم کو ملی ہے كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (اور جب پھل آئے تو ان کا پھل کھاؤ اور کاٹنے کے وقت اس کا حق دو)

چونکہ ہمارے قبضہ میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے، اس وجہ سے اسراف ناجائز ہوا۔ اور چونکہ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی مالکیت کی سب سے بڑی شہادت دی یہاں تک کہ اپنی جان اور اپنے محبوب لخت جگر کو بھی اس کی راہ میں پیش کر دیا، اس وجہ سے قربانی کے بیان کے لیے انہی کا نمونہ مثال قرار دیا گیا کیونکہ خدا کی امانت خدا کے حوالہ کرنے کی اس سے بڑھ کر کوئی اور مثال نہیں تھی۔

۱۱۔ یہ دونوں تقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ نماز کی سب سے زیادہ نمایاں حقیقت توجہ الی اللہ ہے۔ جو شخص نماز میں ہے وہ گویا اپنے رب کے حضور کھڑا ہے اور اس سے مناجات و گفتگو کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دہنے بائیں کسی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ نماز نہ صرف ذریعہ تقرب بلکہ عین تقرب ہے۔ یہ آیت اس کی دلیل ہے۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (اور سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ) اس لیے نماز راس العبادات قرار پائی۔ میرے خیال میں عربی میں صلوٰۃ کا اصلی مفہوم بھی قربت قریبہ ہی کا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف بڑھنا اور اس میں داخل ہو جانا، اسی لیے گھوڑدوڑ کے اس گھوڑے کو جو اگلے گھوڑے کے بعد ہو مصلی کہتے ہیں۔ جو شخص آگ کے پاس نہایت قریب ہو کر تاپ رہا ہو، اس کو صالی کہتے ہیں۔ یہی لفظ اس شخص کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا جو آگ میں گھس جائے۔

بعینہٖ یہی حقیقت قربانی میں بھی مضمر ہے۔ قربانی کرنے والا اپنی قربانی ایسی جگہ لاتا ہے، جو اس کے خیال میں خدا کی طرف سے اس عبادت کے لیے مخصوص اور مقدس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے قربانی کے لیے ایک مخصوص و متعین جگہ قرار پائی۔ یہود کے یہاں بیت المقدس کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں۔ لیکن مسلمانوں کے لیے جس طرح تمام روئے زمین کو مسجد ہونے کا شرف حاصل ہوا، اسی طرح قربانی بھی ان کے لیے ہر جگہ جائز ہوئی۔ تاہم جس طرح مسجد کی نماز کو فضیلت حاصل ہے اسی طرح قربان گاہ پر قربانی کرنا بھی افضل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ متعین فرمائی تھی۔ یہی جگہ ہمارے لیے بھی مخصوص ہوئی۔ چنانچہ جس طرح ہم ان کی تعمیر کی ہوئی مسجد کے لیے سفر کرتے ہیں، اسی طرح اپنی قربانی کے جانوروں کو بھی ان کی قربان گاہ پر لے جاتے ہیں۔ ان باتوں کا مقصد ہمارے دل میں یہ اعتقاد راسخ کرنا ہے

کہ ہماری حیثیت خدا کے غلاموں اور چاکروں کی ہے جو لبیک کہتے ہوئے آقا کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنی بندگی کے اقرار کے لیے اپنی قربانیاں اس کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ پس جس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر صلوٰۃ کو صلوٰۃ کہا گیا ہے، اسی حقیقت کی رعایت سے قربانی کے لیے قربانی کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے۔

سمنوا ضحایاکم فانها مطایاکم

اپنی قربانیوں کو فربہ کرو، کیونکہ وہ تمھاری سواریاں ہیں۔

اس میں بھی اسی حقیقت کی جھلک ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اونٹ کی قربانی اس امت کے مخصوصات میں سے ہے (دیکھو فصل ثانی)

۱۲۔ نماز اور قربانی عبادت کے تمام طریقوں میں سب سے زیادہ قدیم اور فطرت انسانی میں سب سے زیادہ اترے ہوئے ہیں۔ سجدہ، رکوع اور نذر اظہار بندگی کے وہ مقبول عام طریقے ہیں جو ہر قوم و ملت میں، عام اس سے کہ وہ ایک خدا کی پرستار رہی ہو یا متعدد دیوتاؤں کی۔ اس نے کسی روح یا بت کو پوجا ہو یا کسی انسان کو معبود بنایا ہو، عام رہے ہیں۔ بلاشبہ مہذب اور وحشی قوموں اور برحق اور گمراہ جماعتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق ان کی نمازوں اور قربانیوں میں بھی نمایاں رہتا ہے، تاہم نماز اور قربانی کی مقبول و محبوب عبادت کسی نہ کسی شکل میں، خواہ وہ کتنی ہی مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہو، ہر جماعت میں پائی گئی ہے۔ جس طرح معبود کے ایک عام مفہوم میں باہمگر متفق ہونے کے باوجود، خود معبود کے بارے میں قوموں کے آرا و معتقدات نے الگ الگ راہیں اختیار کر لیں اسی طرح ان عبادتوں کی شکلیں اور صورتیں بھی ہر ایک کے یہاں مختلف سانچوں میں ڈھل گئیں۔ لیکن ایک مشترک حقیقت پر سب کا اتفاق باقی رہا، باقی عبادات کے بارے میں تم کو یہ اتفاق رائے نظر نہیں آئے گا۔

پہلے سبب کی تفصیلات کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایمان اور اسلام تمام کائنات کو محیط ہیں، اور نماز و قربانی انہی دونوں کی صورتیں ہیں۔ اب مذکورہ بالا حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے بعد تم پر یہ راز بھی کھل گیا ہوگا کہ دین اور عبادت کی راہ میں چلے تو سب ایک ہی نقطے سے تھے، لیکن اوہام و ظنون اور اغراض و بدعات نے خلط مبحث کر کے لوگوں کو بے شمار راہوں پر ڈال دیا۔ یہ اختلاف جو آج نظر آ رہا ہے محض افراط و تفریط اور افساد و اختلاط کا نتیجہ ہے۔ یہ حقیقت کا اختلاف نہیں ہے۔

۱۱۔ تمام ملتوں پر ملّتِ مسلمہ کی فضیلت

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ نماز کو جس طرح تمام عبادات پر فضیلت اور ترجیح حاصل ہے اسی طرح قربانی پر بھی اس کو فضیلت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے بیان میں خدا نے اس کو مقدم رکھا ہے۔ ان دونوں کی باہمی مناسبت پر ہم نے جو تقریر کی ہے اس پر غور کرنے کے بعد اس فضیلت کی وجہ اور ان دونوں کی عظمت بالکل واضح ہو جائے گی۔ لیکن ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ کوثر کی عظیم الشان نعمت صرف ہمارے لیے مخصوص کرنے اور نماز اور قربانی کے ایک ساتھ ذکر کرنے سے کیا خاص نتائج نکلتے ہیں؟ ہمارے نزدیک اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ امت مسلمہ کو تمام دوسری ملتوں پر فضیلت حاصل ہے۔

۲۔ یہود اور نصاریٰ کے توبہ کی قبولیت ان کے اسلام لانے پر منحصر ہے۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ کے وارث صرف وہ لوگ ہیں جو اسلام لائے ہیں۔

ان امور کے سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے، اس وجہ سے ہم یہاں ان پر بالاجمال گفتگو کریں گے۔

تمام قدیم مذاہب میں خدا کے تقرب کا سب سے بڑا ذریعہ قربانی تھا۔ یعنی ہمارے یہاں جو رتبہ نماز کو حاصل ہے۔ وہی رتبہ دوسرے مذاہب میں قربانی کو حاصل ہے۔ یہود کے ہاں بھی یہی رجحان پایا جاتا ہے۔ انھوں نے نماز کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں کیا ہے، اور روزے کا ذکر اگر کیا بھی ہے تو کنایات و اشارات کے پردہ میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عقل حقیقی بلوغ کو نہیں پہنچی تھی اس وجہ سے مجرد توجہ الی اللہ، جو نماز کی حقیقت ہے، ان کی روحانی تربیت کے لیے کفایت نہیں کر سکتی تھی۔ اس سبب سے ملت اسلام میں نماز کو مقدم کرنا اور اس کو دین کا مغز قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ دین نے اپنی ترقی کا قدم عروج و کمال کے آخری زینہ پر رکھ دیا۔ لیکن یہ اہم نکتہ فراموش نہیں کرنا چاہیے، کہ طبیعتوں کے مدارج فطرتاً مختلف ہوتے ہیں۔ ایک قوم علم و حکمت کے ذرہ کمال تک پہنچ جاتی ہے۔ بایں ہمہ اس میں بہت سے ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو طفولیت عقلی کے ابتدائی مراحل میں ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اسلام نے اگرچہ نماز ہی کو ستون دین قرار دیا اور اپنے نظام میں اس کے لیے جو جگہ مخصوص کی وہ کسی عبادت کو نہ دی۔ تاہم اس نے قربانی کو بالکلیہ مٹایا نہیں، حتیٰ کہ اس نے ان قدیم قوموں کی یادگار بھی اپنے دینی مراسم میں باقی رکھی جو دین کو محض رہبانیت خیال کرتی تھیں۔ چنانچہ اس کے کچھ آثار حج کے مراسم میں موجود ہیں۔

نصاریٰ کا حال دینی مراسم میں یہود کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف نماز نماز ہے، قربانی کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ لیکن اس چیز کی وجہ سے وہ ایک کامل مذہب پر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے، کیونکہ کمال اعتدال میں ہے۔ غلو سے کبھی کوئی بھلائی وجود میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ اسی غلو کا نتیجہ ہے کہ دین کی اصل بنیاد یعنی ایمان کے معاملہ میں وہ یہود سے بھی نیچے گر گئے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اعمال کے معاملہ میں یہود ان سے پست حالت میں تھے۔

اسی نقطۂ اعتدال کی رعایت اور ہر چیز کو اس کی اصلی جگہ دینے کی حکمت ہی کا تقاضا ہے کہ قرآن میں سب سے زیادہ ذکر نماز کا آتا ہے اور "نحر" کا لفظ بجز اس سورہ کے پورے قرآن میں کہیں نہیں آیا ہے۔ جن چند جگہوں پر تضحیہ (قربانی کرنا) کا ذکر آیا ہے، وہاں بھی تبعاً آیا ہے۔ پس چونکہ امتِ مسلمہ کے لیے نماز اور قربانی دونوں عبادتیں یک جا کی گئی ہیں اور خدا نے ان کے فلسفہ اور ان کی عظمت کو پوری طرح ہمارے لیے واضح کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے پاس یہ کہنے کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں کہ اس جامع شریعت کو دوسری تمام شریعتوں اور ملتوں پر فضیلت بخشی گئی ہے۔

مشرکین اور ملاحدہ کا ذکر تو بالکل نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ان کی نماز اور قربانی خدا کے لیے ہوتی ہی نہیں۔ اس وجہ سے وہ سرے سے خارج از بحث ہیں۔ رہے یہود و نصاریٰ تو وہ صرف شریعت کے ایک رکنِ اعظم ہی سے محروم نہیں ہیں بلکہ یکقلم دین ہی سے محروم ہیں، کیونکہ وہ ایک ایسے مذہب پر قانع ہو گئے ہیں جو صرف ایک محدود مدت کے لیے بھیجا گیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نصاریٰ کا مذہب تجرد اور ترک دنیا کا مذہب تھا۔ اس میں ہر شخص پر صرف اس کے اپنے

نفس کی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا تھا، اس وجہ سے ان کو جہاد کا حکم نہیں دیا گیا۔ صرف روزہ، نماز اور زکوٰۃ پر قائم رہنے کا حکم ہوا۔ اور ان عبادات کو بھی پوشیدہ طور پر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ یہ طریقہ اگرچہ ان کی اصلاح و تربیت کے لیے نہایت موزوں تھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے فرائض و سنن اس اخفاء اور رازداری کے پردے میں غائب ہو گئے، اور آہستہ آہستہ انھوں نے یہ تمام تعلیمات ضائع کر دیں۔ چنانچہ موجودہ انجیلیں روزہ اور نماز کا حکم بحیثیت فرائض کے نہیں دیتیں بلکہ ان کو صرف مستحبات کا درجہ دیتی ہیں اور سعی و تدبیر، کسب و محنت اور عوض و انعام کی بالکل مخالف ہیں۔ جب انھوں نے اپنی شریعت کا ایک بڑا حصہ ضائع کر دیا (وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ) تو اس کی جگہ ان کی بدعات و خرافات نے لے لی۔ چنانچہ ان میں یہ اعتقاد پھیل گیا کہ چونکہ حضرت مسیحؑ اپنی تمام امت کی طرف سے قربان ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے قربانی کے حکم کی ذمہ داریوں سے اب وہ سبکدوش ہو گئے۔ اس خیال میں یہود کی شریعت کے اس حکم کی جھلک نظر آتی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ کسی گناہ کا کفارہ بغیر خون بہائے نہیں ادا ہو سکتا۔ چنانچہ ان کے خیال میں حضرت مسیحؑ نے اپنا خون بہا کر اپنی تمام امت کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس عقیدہ کے اختیار کر لینے کے بعد نصاریٰ کے لیے دو باتوں میں سے ایک کا ماننا لازمی ہو گیا اور یہ دونوں باتیں کفر و الحاد ہونے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ یا تو وہ یہ تسلیم کریں کہ حضرت مسیحؑ نے ان کے مستقبل کے بھی تمام گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ چنانچہ ان کے ایک فرقہ کا عقیدہ ہے بھی کہ حضرت مسیحؑ پر محض ایمان لانا ہی نجات کے لیے کافی ہے۔ اور یہ رجائیت کی بدترین صورت ہے یا یہ مانیں کہ مستقبل کے گناہوں کی مغفرت کی اب کوئی صورت باقی ہی نہیں رہی، جیسا کہ ان کے ایک فرقہ اور ان کے امام پولوس کا خیال ہے۔ اور یہ معتزلہ کی اس غلطی سے بدرجہا بڑھ کر ہے جس کے وہ رجائیت کی حد سے بڑھی ہوئی مخالفت میں مرتکب ہوئے ہیں۔

یہی ابتری یہود کے ہاں بھی ہے۔ ان کے ہاں بھی دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ بغیر قربانی کے مغفرت نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ ہیکل کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں ہے۔ ان دونوں حکموں کی موجودگی میں ان کے ہاتھوں سے ہیکل کے نکل جانے کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے مذہب کی رو سے ان پر توبہ کا دروازہ ہی بند ہو گیا اور ان کے لیے اس کے سوا اب اور کوئی راہ باقی ہی نہیں رہی کہ اس نبی موعود (صلعم) پر ایمان لائیں جس کی بعثت سے ان کی تمام آرزوئیں وابستہ کی گئی تھیں اور جس کو پوری طرح ان کے انبیاء نے ان کو پہچنوا دیا تھا۔ قرآن مجید میں جس جگہ یہود کو آخری اور کامل شریعت کے ناقابل ٹھہرایا گیا ہے اور حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے مغفرت چاہی ہے، وہاں اس وعدہ کا بھی ذکر ہے۔

قَالَ عَذَابِىْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ۚ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِىَّ الْاُمِّىَّ الَّذِىْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِى التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۔ (الاعراف - ۱۵۶ - ۱۵۷)

کہا، میں اپنا عذاب جس پر چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز کے لیے عام ہے پس میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ پر قائم رہیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جو اس رسول اور نبی امی کی پیروی کرتے ہیں، جس کو وہ اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ تین لفظوں کی ایک آیت (فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ) دنیا کے تمام مذاہب پر بھاری ہے۔

اگر یہودیت و نصرانیت کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور اس آیت کو دوسرے میں تو پہلے لفظ کے وزن سے یہ یہودیت پر بھاری ہو جائے گی اور دوسرے لفظ کا وزن اس کو نصرانیت پر بھاری کر دے گا، اور چونکہ بقیہ تمام دنیا کی قربانیاں غیر اللہ کے لیے ہیں اور سب نے اللہ واحد کو چھوڑ کر ارباب و اصنام ٹھہرا لیے ہیں اس وجہ سے بیچ کا عظیم الشان لفظ، اس کا پلہ تمام عالم سے گراں کر دے گا۔

پھر حسن نظم کا اعجاز دیکھیے کہ آپ سے آپ خدا پرستی کی کیسی سیدھی اور صاف راہ باز ہو گئی ہے۔ اللہ کی بندگی کی راہ یہ ہے کہ ہر حال میں خدا کی یاد کی جائے اور دل برابر اس کی طرف متوجہ رہے اور زمانہ اور حالت کی رعایت کے ساتھ ہر موزوں تشکل میں اس کے سامنے عجز و نیاز کی نذر گزرانی جائے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی وراثت نبی امی صلعم اور آپؐ کے پیروؤں کی طرف منتقل کر دی اور اس مخصوص وراثت سے یہود و نصاریٰ کو محروم کر دیا، اس وجہ سے اس نماز اور اس قربانی کا حکم دیا جو اس امت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ جیسا کہ بالکل واضح ہے حضرت ابراہیمؑ نے ایک مسجد کی تعمیر کی تھی، کوئی قربان گاہ نہیں بنائی تھی۔ خود قرآن کے الفاظ اس کی شہادت دے رہے ہیں۔

طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔

میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔

اس سے صاف واضح ہے کہ دین ابراہیمی کی اصل روح نماز ہی میں پوشیدہ تھی۔ رہی قربانی تو یہ ان کی اور ان کے اطاعت شعار فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کی فدویت و جاں نثاری کی یادگار ہے۔ چنانچہ اسی سبب سے اس سنت کے قیام و احیاء کے لیے مقام مروہ مخصوص ہوا، جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کی جگہ ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ نے اس کو حجاج بیت اللہ کی میزبانی کی یادگار رہنا کر اس کو ہمیشہ کے لیے قائم و ثابت کر دیا۔

یہود کی عبادت تمام تر قربانی تک ہی محدود تھی اور یہ بھی ان تمام حقائق و ارشادات سے یکسر خالی تھی جن کی طرف قرآن حکیم نے جابجا راہنمائی کی ہے۔ ان کے ہاں کوئی ایک شہادت بھی اس بات کی نہیں ملتی کہ ان کی یہ قربانی حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے۔ ان کی آسمانی کتاب خود ان کے اس دعوےٰ کی بہمہ وجوہ تردید کرتی ہے جیسا کہ ہم مفصل اس کے مقام پر لکھ چکے ہیں[1]۔

چونکہ صورت معاملہ یہ تھی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر "نحر" کا لفظ استعمال کیا جو اونٹ کے ذبح کے لیے مخصوص ہے اور اونٹ کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ یہود پر حرام تھا۔ اس بحث کی تفصیلات سورۂ بقرہ اور آل عمران سے متعلق ہیں، یہاں اجمالی اشارہ کافی ہے۔ یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہیے کہ اونٹ کی قربانی میں یہود کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ قربانی صرف ابراہیمی قربانی ہے، جو حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد کے لیے مخصوص ہے۔

---

[1] اشارہ ہے رسالہ الرای الصحیح فی من ھو الذبیح کی طرف، جس کا اردو ترجمہ پہلے ہمارے قلم سے نکل چکا ہے اور اب پھر اس کی اشاعت کا بندوبست ہو رہا ہے۔ (مترجم)

۱۲- شَانِئَكَ اور اَلْاَبْتَرُ کی تاویل

آخری آیت کی تاویل سے پہلے اس کے دو لفظوں شَانِئَكَ اور اَلْاَبْتَرُ پر غور کر لینا چاہیے۔

لفظ "شانی" معرفہ کی طرف مضاف ہو کر خود معرفہ کے حکم میں آ گیا ہے۔ اگرچہ معرفہ کے لیے تعین و تشخص لازمی چیز نہیں ہے تاہم بعض مفسرین نے یہاں تعیین کرنی چاہی اور چونکہ انھوں نے استنباط عام احوال و واقعات کو سامنے رکھ کر کیا ہے اس وجہ سے جیسا کہ اس حالت میں متوقع ہے، ان کے اقوال مختلف ہو گئے ہیں۔ ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد عاصم بن وائل ہے، جس نے کہا تھا "انا شانی محمد" (میں محمد کا دشمن ہوں) شمر بن عطیہ سے روایت ہے کہ یہ عقبہ بن معیط ہے۔ وہ یہ کہا کرتا تھا کہ پیغمبر کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہے گی، ان کی نسل منقطع ہے۔ اسی طرح ابن عباسؓ اور عکرمہؓ کے بعض اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس سے قریش کو مراد لیتے ہیں۔ میرے نزدیک اگرچہ اس لفظ کا مصداق کوئی مخصوص شخص ہونا چاہیے اور آیت کا اولین محل وہی ہوگا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا نام لے کر اس کی فضیحت نہیں پسند کی تو بہتر یہی ہے کہ ہم بھی اس کو نام کے ساتھ متعین کرنے کی کوشش نہ کریں۔

یہ تفصیلات اس صورت سے متعلق ہیں جب یہاں کسی معین شخص کو مراد لیا جائے لیکن، جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں معرفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ بے خطر راہ یہ ہے کہ استنباط کی باگ قرآن مجید کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اس کا نظم و سیاق جس طرف اشارہ کرے اسی طرف چلنا چاہیے۔ پچھلی سورہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ رجحان کلام قریش کی طرف ہے، تمام قابل اعتماد روایات اسی پہلو کی تائید کرتی ہیں۔ پھر حالات و قرائن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہی اس لفظ کے سب سے زیادہ صحیح مصداق ہو سکتے ہیں۔ ہمارے پچھلے مباحث کا اقتضا بھی یہی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اولاً اور بالذات تو اس سے قریش ہی کو مراد لینا چاہیے۔ پھر ہر اس جماعت یا شخص کو جس میں یہ صفت پائی جائے۔ موقع نزول کی خصوصیات کسی لفظ کی وسعتوں کو محدود نہیں کرتیں۔ یہاں اس لفظ سے متعلق اتنی ہی گفتگو کافی ہے۔ آیت کی تفسیر کے ذیل میں مزید تفصیل ملے گی۔

"ابتر" بتر سے صفت کا صیغہ ہے۔ "بتر" کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ یہ لفظ عربی زبان میں مختلف طریقوں سے استعمال ہوا ہے، جن پر غور کرنے سے اس معنی کی طرف رہبری ہوتی ہے جو یہاں مراد ہے۔ اس وجہ سے اس مادہ کے مشتقات ہم ان کی معنوی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

سیف باتر یا بتّار، شمشیر برّاں کو کہتے ہیں۔ بتر فلان رحمہ (فلاں شخص نے رشتۂ رحم کو کاٹ دیا) اسی سے اباتر ہے، جس کے معنی قاطع رحم کے ہیں۔ ابتر الرجل کے معنی ہیں۔ اس نے دیا پھر رک گیا۔ حجۃ بتراء برہان قاطع کو کہتے ہیں۔ قربانی والی حدیث میں ہے۔ انہ نھی عن المبتورۃ (آپ نے دم بریدہ جانور کی قربانی سے منع فرمایا) ابتر ایک خاص سانپ کو کہتے ہیں جس کی دم چھوٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح ابتر اس شخص کو کہتے ہیں جس کی نسل منقطع ہو۔ حدیث میں ہے کل امر ذی بال لم یبدأ بسم اللہ فھو ابتر (جو اہم کام اللہ کے نام سے نہ شروع کیا جائے وہ ابتر ہے) جو خطبہ حمد و صلوٰۃ سے خالی ہو اس کو بتراء کہتے ہیں۔ بتراء اس مشک یا ڈول کو بھی کہتے ہیں جس میں لٹکانے کی رسی یا تسمہ نہ ہو۔

ابتر: گدھے اور غلام کے لیے بولا جاتا ہے۔ سورج کی تمازت اور اس کی شعاعوں کی تابانی جب ماند پڑ جاتی ہے اور صرف زرد سی ٹکیا باقی رہ جاتی ہے تو اس کو 'بتیرا' کہتے ہیں۔

ان تمام مشتقات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'ابتر' اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ان تمام چیزوں سے محروم ہو گیا ہو، جو اس کی عزت و عظمت اور قوت و شوکت کا ذریعہ ہو سکتی ہوں۔ چنانچہ دیکھو، سورج جب اپنی شعاعوں کی فوج سے الگ ہو کر، اپنے تمام جلال و عظمت سے محروم ہو جاتا ہے اور ایک چھوٹی سی ٹکیا کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے تو اس کو 'بتیرا' کہتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص اپنے رشتۂ رحم کو کاٹ کر اپنے اعوان و انصار کی حمایت سے محروم ہو جاتا ہے اس کو 'ابتر' کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے 'ابتر' کا لفظ گدھے اور غلام کے لیے بولا گیا کہ قبیلہ میں سب سے زیادہ کم حمایتی انہی کے ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر قتادہؓ نے 'ابتر' کے معنی، حقیر و ذلیل کے بتائے ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ مقطوع کے معنی سے چل کر صغیر و تصغیر کے معنی میں آیا۔ پھر بے یار و مددگار اور حقیر و ذلیل کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

ان دونوں لفظوں کی تفسیر سے فارغ ہونے کے بعد اب ہم آیت کی تاویل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۱۳۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کی تاویل

اس میں شبہ نہیں ہے کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ان لوگوں کے جواب میں ہے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ کے طور پر ابتر کہا تھا۔ تمام مفسرین نے ایسا ہی سمجھا ہے اور ہم کو بھی اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔ لیکن اس کہنے سے ان کا مطلب کیا تھا؟ اس کا جواب کسی قدر محتاج تفصیل ہے۔

جب آنحضرت صلعم نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو قریش نے خیال کیا کہ آپ نے رشتۂ رحم کاٹ کر ایک طرف عرب کے معزز ترین خاندان کی تمام عظمتوں اور حمایتوں سے اپنے کو محروم کر لیا اور دوسری طرف تولیت کعبہ اور اس کی مجاوری کی جو عزت و سعادت اس خاندان کے واسطے سے آپ کو حاصل تھی، وہ بھی آپ نے اپنے ہی ہاتھوں برباد کر دی۔ اس کے بعد آپ کی حیثیت ان کی نظر میں محض ایک شاخ بریدہ کی تھی جو اپنے تنا سے الگ ہو کر خشک اور فنا ہو جانے کے لیے چھوڑ دی گئی ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو برکت و کثرت اور فتح و نصرت کی بشارت دی کہ آپ کے دشمنوں کا خیال بالکل غلط ہے وہ خود ہی بے یار و مددگار اور تباہ و برباد ہوں گے۔ اور چونکہ یہ بات ان کے خیال کی تردید میں کہی گئی ہے اس وجہ سے اس میں ایک لطیف تعریض بھی ہے کہ آپ کے دشمن جس عزت پر آج فخر کر رہے ہیں وہ عنقریب ان سے چھن جائے گی۔ اس پہلو سے اس آیت میں فتح مکہ کی بشارت بھی ہے۔

لغت اور نظم کلام کے علاوہ روایات سے بھی اس مطلب کی تائید ہوتی ہے۔ امام سیوطی کہتے ہیں۔

بزار وغیرہ نے بسند صحیح ابن عباس سے تخریج کی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ کعب بن اشرف مکہ آیا، تو قریش نے اس سے کہا، تم اہل مدینہ کے سردار ہو۔ اس شخص کو دیکھتے ہو، جو اپنی قوم سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا ہے اور پھر بھی اپنے آپ کو ہم سے افضل خیال کرتا ہے حالانکہ حجاج کے نگران، ان کو پانی پلانے والے، اور خانہ کعبہ کے کلید بردار اور متولی ہم ہیں۔ کعب نے جواب دیا تم اس سے افضل ہو۔ اس پر اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ والی آیت اتری۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں تخریج کی ہے کہ ابن المنذر عکرمہ سے راوی ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی سے مشرف فرمایا تو قریش نے کہا کہ محمد ہم سے کٹ گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اِنَّ شَانِئَكَ والی آیت نازل فرمائی۔

امام احمد وغیرہ نے اسی مضمون کی روایتیں تخریج کی ہیں جو حضرت ابن عباس سے مروی ہیں۔

بعینہٖ اسی مضمون کی ایک روایت ابن جریر نے بھی تخریج کی ہے جو ابن عباس سے مروی ہے کہ جب کعب بن اشرف مکہ آیا تو قریش اس سے ملے اور کہا کہ ہم حجاج کو پانی پلاتے ہیں اور کعبہ کے کلید بردار ہیں، تم اہل مدینہ کے سردار ہو، بتاؤ ہم بہتر ہیں یا یہ شخص جو اپنی قوم سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا ہے اور اپنے کو ہم سے افضل خیال کرتا ہے۔ اس نے کہا تم افضل ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ والی آیت نازل فرمائی اور اسی موقع پر یہ آیت بھی نازل ہوئی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۔ (نساء - ۵۱-۵۲)

کیا تونے دیکھا ان لوگوں کو جن کو کتاب آسمانی کا ایک حصہ ملا ہے وہ جبت و طاغوت پر ایمان لاتے ہیں اور کفار سے کہتے ہیں کہ تم لوگ مسلمانوں سے زیادہ راہ یاب ہو۔ یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی پھٹکار ہے اور جن پر خدا کی پھٹکار ہوئی تم ان کے لیے کوئی مددگار نہیں پا سکتے۔

بعینہٖ اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت عکرمہؓ سے بھی ہے صرف ونحن اهل الحجيج وعندنا منحر البدن کے الفاظ اس میں زیادہ ہیں۔

یہ تمام روایتیں، تقریباً ہم معنی ہیں۔ قریش کو اپنے خاندانی شرف اور اپنی برتری نیز بیت اللہ کی مجاوری و خدمت اور قربانی پر بڑا ناز تھا۔ وہ اسی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو خیال ہوا کہ جو شخص ان سے علیحدہ ہو گیا وہ اس شاخ بریدہ کے مانند ہے جس کا خشک ہو کر فنا ہو جانا یقینی ہے۔ وہ اپنے اس گمان میں مگن تھے کہ یہودی سردار کی تائید نے ان کے اس گمان کو مزید قوت دے دی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ غلط فہمی دور کر دی کہ جو خیال تم پیغمبر عالم (صلعم) کے متعلق قائم کر رہے ہو وہ بالکل غلط ہے۔ البتہ تم خود عنقریب مخذول اور ذلیل ہو گے۔ اور وہ تمام نعمتیں جو تم کو خانہ کعبہ کی تولیت کے سلسلہ میں ملی تھیں، تمھاری شرارتوں اور بدعہدیوں کی پاداش میں، تم سے چھین لی جائیں گی۔ چنانچہ سورۂ براءت کے نزول نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو سچ کر دیا اور خانہ کعبہ سے مشرکین کا رشتہ یک قلم منقطع کر دیا گیا۔ یہاں یہ مجمل اشارات کافی ہیں۔ پندرھویں فصل میں اس کے متعلق مزید تفصیلات آئیں گی۔

سورہ کا موقع نزول اور فتح مکہ کی بشارت

پچھلی فصلوں میں گزر چکا ہے کہ یہ سورہ فتح مکہ کی بشارت ہے اور اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ میں ماضی کا صیغہ اس امر کی دلیل ہے کہ یہ وعدۂ فتح عنقریب پورا ہونے والا ہے۔

قرآن مجید کی ایک سے زیادہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلعم کو کفار کی مخالفتوں کے مقابل میں صبر و انتظار کا حکم دیا ہے اور

اگرچہ فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے لیکن ہر وعدہ میں ایک قسم کا ابہام نظر آتا ہے، مثلاً:

وَإِن مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ۔ (رعد - ۴۰)

ہم ان کو جس چیز کی دھمکی دے رہے ہیں، اس کا کچھ حصہ یا تو تم کو دکھا دیں گے یا دکھانے سے پہلے تم کو اٹھا لیں گے، تمھارے اوپر صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے، مواخذہ کرنا ہمارا کام ہے۔

دوسری جگہ ہے:

فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُم مُّنتَقِمُونَ أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِم مُّقْتَدِرُونَ۔ (الزخرف - ۴۲)

یا تو ہم تم کو اٹھا لیں گے پھر ہم ان سے انتقام لیں گے یا تمھیں دکھائیں گے وہ چیز جس کی ہم نے ان کو دھمکی دی ہے کیونکہ ہم کو ان پر پوری طرح قابو حاصل ہے۔

ان آیتوں سے صاف نہیں کھلتا تھا کہ آنحضرت صلعم کے ساتھ کس طرح کا معاملہ ہوگا؟ آپ حضرت عیسیٰ کی طرح نصرت الٰہی کے ظہور سے پہلے ہی اٹھا لیے جائیں گے یا حضرت نوح علیہ السلام کی طرح غلبہ و نصرت ربانی کا جلال دیکھ کر یا ان دونوں سے الگ آپ کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا سا معاملہ پیش آئے گا، جن کو فتح و نصرت کا کچھ حصہ ان کی زندگیوں میں دکھا دیا گیا، لیکن اس کے کامل ظہور کا وعدہ آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا۔ اسی وجہ سے مسلمان ایک صاف و صریح وعدہ کے لیے بے قرار تھے۔ اس آیت نے نازل ہو کر مسلمانوں کو فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی، اور جو بات اب تک صرف اشارات میں کہی گئی تھی وہ بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آگئی۔

اس وجہ سے قیاس یہ ہے کہ یا تو یہ سورہ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا پہلی فتح یعنی صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی ہے۔ روایات سے بھی ہمارے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے۔ ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں مندرجہ ذیل روایت نقل کی ہے۔

"سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ قربانی کرکے لوٹ جاؤ۔ آنحضرت اٹھے اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ (راوی کو شبہ ہے) کا خطبہ دیا۔ پھر دو رکعت نماز ... کی اور قربانی کی۔ اسی وقت حضرت جبرئیل نے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا پیام دیا۔"

امام سیوطیؒ نے یہ حدیث نقل کرکے لکھا ہے کہ "اس میں سخت غرابت ہے" لیکن اس غرابت کی کوئی وجہ انھوں نے نہیں بیان کی۔ چونکہ یہ روایت مختلف وجوہ سے ان کو مشہور خیال کے مخالف نظر آئی۔ اس وجہ سے انھوں نے وجہ غرابت کی تشریح ضروری نہیں سمجھی۔ حالانکہ جن اسباب سے ان کو یہ وہم ہوا ہے وہ غور و تامل کے بعد، بالکل بے حقیقت ہو جاتے ہیں۔ ہم اجمالاً ان کو یہاں بیان کیے دیتے ہیں تاکہ ان کے ضعف کا اندازہ ہو سکے۔

۱۔ انھوں نے خیال کیا کہ یہ سورہ مکی ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے بعد پیش آیا ہے۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے، علماء نے یہ تصریح کر دی ہے کہ جو صورتیں ہجرت کے بعد مکہ کے قریب نازل ہوئی ہیں، وہ بھی مکی ہی کہلاتی ہیں۔ حدیبیہ مکہ سے بالکل قریب ہے۔ دونوں کے درمیان صرف ایک منزل کی مسافت ہے۔ برعکس اس کے حدیبیہ اور مدینہ کے درمیان نو منزلوں کی مسافت ہے لیکن حدیبیہ حدود حرم میں داخل ہے۔

۲۔ دوسرا شبہ یہ ہوا کہ حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے ۵ سال ۸ مہینے کے بعد پیش آیا اور کعب بن اشرف ہجرت کے تیسرے سال قتل ہوا ہے اور روایات میں آتا ہے کہ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ اس کے اس سوال کے جواب میں نازل ہوئی ہے جو قریش نے اس سے پوچھا تھا اور جس کی تفصیل پچھلی فصل میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے اس سورہ کا حدیبیہ کے موقع پر اترنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جب کسی آیت کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس طرح کے موقع پر اتری تو اس کا مطلب کوئی متعین و مخصوص وقت نہیں ہوتا، بلکہ ایک خاص حالت کے ساتھ آیت کی مطابقت ظاہر کرنی مقصود ہوتی ہے۔ اس وجہ سے إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ سے وہ تمام جماعتیں مراد ہو سکتی ہیں جو آنحضرت صلعم کی دشمن ہوں، خواہ وہ فنا ہو چکی ہوں، یا قیامت تک ظاہر ہوتی رہیں۔ اس آیت کے نزول کے وقت تک آپؐ کے جو اعداء ذلت و نامرادی کی موت مر چکے تھے وہ گویا سب باقی رہ جانے والے دشمنوں کے لیے مثال عبرت تھے۔ کعب سے گفتگو کرنے کے بعد یہ نہیں ہوا تھا کہ قریش نے آنحضرت صلعم کے بارہ میں اپنا فیصلہ بدل دیا ہو بلکہ اس شریر نے جو کچھ ان کے کانوں میں پھونک دیا تھا وہی ان کا اذعان و اعتقاد تھا۔ لیکن جب تائید الٰہی کے ظہور نے آپؐ کے تمام اعداء کو پامال کر ڈالا تو مجبوراً ان کو اپنا یقین بدلنا پڑا۔ پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت قریش کے متعلق ہے، جو کعب کے فریب میں آگئے تھے، ان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ آیت ان کے حال سے بالکل مطابق ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کے طعنہ کا جواب دیا اور اس میں ذرا بھی توقف نہیں فرمایا۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ بعض لوگ اس آیت میں "شانی" سے عقبہ بن معیط کو مراد لیتے ہیں، کیونکہ اس نے آنحضرت صلعم کو طعنہ دیا تھا کہ آپ کی کوئی اولاد نرینہ زندہ نہیں رہتی۔ اس وجہ سے آپ 'ابتر' ہیں۔ عقبہ بدر میں قید ہوا اور بدر کے جو قیدی قتل ہوئے ان کے ساتھ قتل کیا گیا۔ لیکن یہ وجہ بھی کوئی قوی وجہ نہیں ہے۔ دوسری وجہ کی تردید میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس وجہ کی تردید کے لیے بھی کافی ہے۔ پھر اس آیت کی صحیح تاویل اس طعنہ سے بالکل بے تعلق ہے۔ 'ابتر' سے یہاں منقطع النسل یا لاولد مراد نہیں ہے۔ یہ تاویل بالکل جہل ہے۔ نظم بھی اس سے اباء کرتا ہے اور روایت کے پہلو سے بھی اس میں ضعف ہے۔ اس وجہ سے سعید بن جبیر کے قول میں کوئی غرابت نہیں ہے بلکہ حق بات یہی ہے۔

اس سورہ کی اوپر والی دو آیتوں کی تفسیر میں محمد بن کعب قرظی سے جو قول مروی ہے اس سے بھی سعید بن جبیر کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"بہت سے لوگ غیر اللہ کے لیے عبادت و قربانی کرتے تھے پس اے محمد جب ہم تم کو کوثر بخشیں تو تمھاری نماز و قربانی صرف ہمارے ہی لیے ہونی چاہیے۔"

وہ گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قریش کوثر کی عظیم الشان نعمت پا کر بھی نعمت سے محروم ہی رہے کیونکہ انھوں نے اس نعمت کی قدر نہیں پہچانی اور اس کا حق ادا نہیں کیا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت ان سے چھین کر تم کو بخشی۔ پس جب ہم اس کو تمھیں دے دیں اور گویا دے چکے تو تم اس کا حق ادا کرو۔

یہ مسلم ہے کہ جب کوئی ایسا کام کرنے کا حکم دیا جائے جو کسی واقع ہونے والی بات پر مبنی ہو، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ بات یا تو واقع ہو چکی ہے یا عنقریب واقع ہونے والی ہے۔ چنانچہ جب سورہ بقرہ اتری تو لوگوں نے اس کے مضمون سے یہی

سمجھا کہ اس کا نزول ظہور غلبۂ اسلام کے وقت ہوا ہے۔ اسی طرح ہم نے بھی محمد بن کعب کے قول "جب ہم تم کو کوثر بخشیں" کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ ہم نے تم کو کوثر بخش دیا اور اس وعدہ کے ظہور کا وقت قریب آچکا ہے۔

۱۵۔ سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک نظر

جو تاویل ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ اگر تم اس کو صحیح تسلیم کر کے اس سورہ پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالو گے اور ان آیات کے تمام حدود و اطراف پر غور کرو گے تو تمھارے سامنے مندرجہ ذیل اہم حقیقتیں آئیں گی۔

۱۔ آنحضرت صلعم وراثت ابراہیمی کے وارث ہیں اور آپ کی بعثت دعائے ابراہیمی کی قبولیت کا ظہور و اعلان ہے۔

۲۔ یہ عطیہ (کوثر) اللہ تعالیٰ نے خائنوں اور ناشکروں سے چھین لیا کیونکہ ایسے لوگ خدا کے یہاں مبغوض ہیں۔ جیسا کہ سورہ حج میں بیان فرمایا ہے۔

۳۔ اس عطیہ سے محرومی ایک مخصوص صفت کا نتیجہ قرار دی گئی ہے، جس سے اس کی اصل علت بھی واضح ہو گئی۔ یعنی پیغمبر کے ساتھ دشمنی اس عطیۂ الٰہی سے محرومی کا سبب ہے۔

۴۔ یہ محرومی و نامرادی اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ وراثت ابراہیمی کے وارث ہیں وہ اللہ کے دوست ہوں گے۔ یعنی یہ وراثت اہل حق اور اصحاب باطل کے درمیان ایک نشانِ امتیاز ہے۔ جو اس سے محروم ہوں گے ان کا شمار دشمنوں میں ہوگا اور جو اس سے سرفراز ہوں گے ان کا شمار دوستوں میں ہوگا۔

۵۔ جب نماز اور قربانی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی دوستی اور محبت کا نشان قرار دیا ہے تو لازماً ان کا ترک اس کی دشمنی کی دلیل ہوگا۔ اور مشرکین اور یہود و نصاریٰ اور اس امت کے تمام مبتدعین اس کے اعداء کے حکم میں داخل ہوں گے۔ کیونکہ ان میں سے بعض نے نماز کا استخفاف کیا ہے اور بعض نے حج کا اور بعض دونوں ہی سے دست بردار ہو چکے ہیں۔ پس جو لوگ نماز، قربانی اور حج کو ضائع کر دیں گے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ٹھہریں گے اور یہود و نصاریٰ کی طرح وراثت ابراہیمی سے محروم ہو کر ذلیل و پامال ہوں گے۔ لیکن اسلام پر اللہ تعالیٰ کا یہ مخصوص فضل و کرم ہے کہ اہل حق اور اصحاب سنت کی ایک جماعت اس کی خدمت کے لیے باقی ہے جو انشاء اللہ فروغ پائے گی اور اسلام کی عزت و شوکت کا ذریعہ ہوگی۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ (محمد - ۳۸)

اگر تم منہ موڑ لو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری جگہ دوسری قوم کھڑی کرے گا۔ پھر وہ تمھاری طرح نہ ہوگی۔

ان تفصیلات سے واضح ہوا کہ یہ سورہ ایک طرف فتح مکہ کی بشارت ہے، دوسری طرف اس میں آنحضرت کے دشمنوں کے لیے وراثت ابراہیمی سے محرومی کی دھمکی ہے۔ اس کا اول اور آخر بالکل مقابلہ کے اسلوب پر ہے اور بیچ کا حصہ گویا برزخ کی طرح دونوں طرف سے متعلق ہے۔ یعنی جو لوگ توحید پر قائم رہ کر نماز اور قربانی کو قائم کریں گے وہ کوثر کی نعمت سے سرفراز ہوں گے۔ اور جو ان کو ترک کریں گے، وہ کوثر سے محروم ہوں گے۔ اس سورہ کی مثال ایک ترازو کی ہے، جس میں دو پلڑے ہیں اور بیچ میں اس کی زبان ہے۔ ایک پلڑے میں خیر کثیر کی گراں مایہ دولت ہے، دوسرے میں محرومی و نامرادی کی ذلت، یا یوں سمجھو کہ

ایک طرف وجود ہے اور دوسری طرف عدم۔ اور جس طرح میزان کی زبان وزن کی طرف جھکتی ہے، اسی طرح بیچ کی آیت پہلی آیت کی طرف جھکتی ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں کے درمیان "فَ" کے ذریعہ ربط قائم کیا گیا ہے۔ برعکس اس کے تیسری آیت بالکل علیحدہ ہے۔ گویا سورہ کا اسلوب ہی اعلان کر رہا ہے کہ حوض کوثر، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین اور جاں نثاروں کا مخصوص حصہ ہے۔ آپ کے اعداء اور مخالفین اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں۔

۱۶۔ امتِ محمد صلعم کے لیے رضوان الٰہی کی بشارت

اوپر گزر چکا ہے کہ جس طرح یہ محرومی آپ کے تمام دشمنوں کے لیے عام ہے اسی طرح یہ بخشش بھی آپ کے لیے اور آپ کی امت کے لیے عام ہے۔ اس وجہ سے یہ بشارت صرف کفر پر اسلام کے غلبہ ہی کی بشارت نہیں ہے بلکہ قیامت کے دن آپ کی امت پر رحمت و رضوان الٰہی کی جو بارش ہوگی اس کی بشارت بھی اس میں مضمر ہے اور آخرت میں حوض کوثر کا بخشا جانا اسی حقیقت کی ایک تعبیر ہے۔

اس سورہ میں جو پیشین گوئی مضمر تھی اس کے واقع ہو جانے کے بعد گویا اس امر کا اعلان ہو گیا کہ مسلمان خدا کے ایمان کی کسوٹی پر پورے اترے اور خدا نے ان سے راضی ہو کر، ان کو قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے چن لیا۔ انبیاء کے حالات اور قرآن کی تصریحات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کا آغاز مصائب اور صبر کے ماحول میں ہوتا ہے اور اس کی انتہا برکات اور اجر پر ہوتی ہے۔ اس لیے مکہ کی فتح نے اعلان کر دیا کہ مسلمان خانہ کعبہ کے متولی اور خدا کی زمین میں دین حق کے گواہ ہیں۔ یہ گویا اس وعدہ کا ظہور ہے جو ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ـ (النور - ۵۵)

جو تم میں سے ایمان لائے اور نیکو کار ہوئے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ جس طرح ان سے پہلے کے لوگوں کو اس نے خلافت دی تھی اسی طرح ان کو بھی زمین میں خلافت دے گا اور ان کے لیے اس دین کو مستحکم کرے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسندیدہ ٹھیرایا ہے اور ان کی خوف کی حالت کو امن و اطمینان سے بدل دے گا۔ وہ لوگ صرف میری ہی بندگی کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیں گے اور ان انعامات کے بعد جس کسی نے کفر کیا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

یہی وہ وعدہ تھا جس کو "اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ" کہہ کر پورا کر دیا۔ ان دونوں آیتوں میں خاص طرح کا تشابہ ہے۔ مذکورہ بالا آیت کے بعد فرمایا ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) جو فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ سے ملتی ہوئی بات ہے۔ پھر فرمایا وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (رسول کی اطاعت کرو کہ تم پر خدا رحم فرمائے) یہ آیت جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ کے ٹکڑے سے مشابہ ہے۔

بالکل یہی حال سورۂ فتح کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امتِ مرحومہ کے لیے امن و رحمت اور رضوان و مغفرت، نیز ارضِ مقدس

پر غلبہ کے جو وعدے فرمائے تھے۔ یہ سورہ تمام تر انہی وعدوں کی تکمیل اور ان کے ظہور کی بشارت ہے۔ انبیاء کے صحیفوں خصوصاً زبور اور امثال سلیمان میں بھی یہ وعدہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید کی بعض آیات میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۔ (انبیاء۔ ۱۰۵)

اور ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھ دیا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

یہاں زمین سے مراد وہ ارض مقدس ہے جو ارض جنت کی مثال ہے اور آل عمران اور سورۂ فیل کی تفسیر میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ جو شرف و عزت مکہ معظمہ کو حاصل ہے وہ اس آسمان کے نیچے زمین کے کسی ٹکڑے کو بھی حاصل نہیں ہے۔

سورۂ کوثر کے نزول کے وقت وعدۂ وراثت کا ظہور ہو چکا تھا یہاں تک کہ وہ پورا ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس "زمین" کفار کے ہاتھوں سے چھین کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے دی اور اس طرح گویا اعلان کر دیا کہ اللہ کے نیک بندے اور اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے مصداق مسلمان ہی ہیں اس وجہ سے زمین کی خلافت و حکومت کے وہ مستحق ہوئے۔

اس وعدہ کے ظہور نے آنحضرت صلعم کے متعلق اس بشارت کی بھی تصدیق کر دی جو آپ کے بارہ میں حضرت موسیٰؑ نے دی تھی کہ جب نبی موعود آئے گا تو اس مقدس کو کفار کے غلبہ سے پاک کرے گا۔ بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء اور سلاطین آئے ان میں سے کسی کے عہد میں بھی اس پیشین گوئی کی تصدیق نہیں ہوئی۔ ان کے تمام صحیفے ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس وجہ سے یہود ایک ایسے پیغمبر کے منتظر تھے جو ارض مقدس کو کفار کے قبضہ سے نکالے۔ قرآن مجید نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۔ (البقرۃ۔ ۸۹)

اور جب ان کے پاس، اللہ کے پاس سے ایک کتاب آئی جو ان کی کتابوں کی تصدیق کرتی تھی اور حال یہ تھا کہ وہ پہلے کافروں پر فتح کے طلب گار تھے تو جب وہ ہر چیز ان کے پاس آ گئی جس کو وہ پہچانتے تھے انھوں نے اس کا انکار کر دیا۔

۱۷۔ نبوتِ محمدی کی ایک دائمی دلیل

یہ سورہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اس امر کا اعلان کر رہی ہے کہ کوثر سے محرومی کی وجہ پیغمبر صلعم کی عداوت ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک مستمر اور دائمی واقعہ کی خبر ہے۔

یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ کسی خاص سرزمین کے متعلق یہ اعلان کر دے کہ اس پر اس کی سلطنت ہمیشہ قائم رہے گی اور اس کے اعداء اس سرزمین سے ہمیشہ محروم رہیں گے۔ زمانہ کے سیل حوادث کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ بڑی بڑی بادشاہتیں اور بڑے بڑے سلاطین اس کے بہاؤ میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ لیکن قرآن نے سورۂ کوثر میں جو اعلان کیا، اس کو زمانہ اب تک باطل نہ کر سکا۔ اس وجہ سے یہ عظیم الشان پیشین گوئی ایک طرف مسلمان کے لیے ایک لازوال بشارت ہے۔ دوسری طرف اس میں خاتم النبیین کی نبوت کی ایک دائمی اور غیر فانی دلیل ہے اور یقیناً یہ پیشین گوئی ان پیشین گوئیوں سے کہیں بڑھ کر ہے، جن کی عمریں ختم ہو چکیں۔ مثلاً عیسیٰ علیہ السلام کی وہ پیشین گوئیاں جن کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے۔

وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ ۔

اور تمھیں پہلے سے بتا دوں گا جو تم کھاؤ گے اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں جمع کرو گے۔

یا دانیال اور حزقیل نبی کی پیشین گوئیاں جن کے ظہور کا اب تک انتظار ہے۔

آنحضرت صلعم کی بعثت ہمیشہ کے لیے تھی۔ اس وجہ سے چند روزہ پیشین گوئیاں آپ کی شانِ رسالت سے فروتر تھیں آپ آخری نبی بنا کر بھیجے گئے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف آپ کے ظہور سے بہت سی اگلی پیشین گوئیوں کی تصدیق فرمائی، دوسری طرف آپ کو ہمیشہ باقی رہنے والی حجتوں سے سرفراز فرمایا۔

پھر پیشین گوئی کا کمال اعجاز یہ ہے کہ وہ ظاہری حالات کے بالکل خلاف ہو۔ اس پیشین گوئی میں یہ شان بھی کمال درجہ موجود ہے۔ یہ سورہ جیسا کہ روایات سے ثابت ہے، صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی ہے جس میں بظاہر غلبہ کفار کو حاصل ہوا تھا۔ صلح کی تمام شرطیں تقریباً انہی کے حق میں تھیں۔ یہاں تک کہ بعض صحابہؓ نے علانیہ شرائط صلح سے اختلاف کیا اور آنحضرت صلعم کے سامنے اپنے اختلاف کا اظہار بھی کر دیا۔ معاہدہ کے بعض الفاظ کو کفار کے اصرار و اختلاف کے سبب سے آنحضرت صلعم نے جب مٹانے کا حکم دیا تو بعض صحابہؓ نے اس کی تعمیل سے انکار تک کر دیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس روز کے ظاہری حالات اس قسم کی کسی پیشین گوئی کے بالکل خلاف تھے۔ یہ پیشین گوئی بالکل اسی قسم کی تھی جیسی پیشین گوئی آپ نے رومیوں کے غلبہ کے بارہ میں فرمائی تھی۔ وہ بھی، جیسا کہ ہم بہ تفصیل لکھ چکے ہیں۔ ظاہری حالات کے بالکل خلاف تھی۔

حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اس نبوت کی جن خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے ان میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی پیشین گوئیاں جلد تر پوری ہوں گی۔ یہاں تک کہ لوگ ان کو دیکھ کر اس کے حق ہونے کا یقین کریں گے۔

"تثنیہ ۱۸ میں ہے:

"میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ جیسا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی باتوں کو، جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا۔ اور معبودوں کے نام لے کر کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیوں کر جانوں کہ یہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں؟ تو جان رکھ کہ جب نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے اور جو اس نے کہا واقع نہ ہو یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی بلکہ اس نبی نے گستاخی سے کہی ہے اس سے مت ڈر۔"

یوحنا باب ۱۶ میں ہے:

"لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمھیں آئندہ کی خبر دے گا۔"

چنانچہ اس سورہ کے نزول کے کچھ ہی دنوں بعد، مکہ فتح ہوا۔ اور مسلمانوں کے لیے یہ پیشین گوئی ایک لازوال بشارت اور کفار کے لیے ایک دائمی انذار اور وعید کی شکل میں پوری ہو گئی۔ ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر غور کرو اس میں آنحضرت صلعم کی رسالت کی صداقت کی کیسی اہم حجتیں مضمر ہیں۔

۱۸۔ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ کا وعدہ اور اس کی تصدیق

پچھلی فصلوں میں جو مباحث گزرے ہیں ان سے یہ حقیقت بالکل روشن ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلعم اور آپ کے متبعین کو خیر کثیر کی دولت بخشی اور آپ کے اعداء کو اس سے محروم فرمایا۔ یہ بعینہٖ اس وعدہ کی تکمیل ہے جو خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا تھا کہ تمام اہلِ زمین ان کی ذریت کے ذریعہ سے برکت پائیں گے اور جو ان پر برکت بھیجے گا وہ مبارک ہوگا اور جو ان پر لعنت بھیجے گا وہ ملعون ہوگا۔ یہ دونوں باتیں اس سورہ میں بھی موجود ہیں۔ پہلی بات اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ میں موجود ہے۔ اور دوسری بات "اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ" میں۔ دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر غور کرو تو تم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلعم میں ایک نمایاں مشابہت نظر آئے گی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و رحمت مقتضی ہوئی کہ تمام برکات کا سرچشمہ حضرت ابراہیمؑ کو بنائے چنانچہ حضرت نوحؑ کے بعد تمام آسمانی برکتوں کے وارث وہی ہوئے جیسا کہ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔
اللہ نے آدمؑ، نوحؑ اور آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام عالم پر برگزیدہ کیا۔

"آلِ عمران" بھی ذریت ابراہیم ہی شامل ہیں۔ اس لیے خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے لیے گویا تمام عالم میں صرف آلِ ابراہیمؑ کا انتخاب ہوا۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے واسطہ سے تمام اہلِ زمین کو برکت دینے کا وعدہ کیا گیا۔

تکوین میں باب ۱۲ میں ہے:

"اور خداوند نے ابرام کو کہا تھا کہ تو اپنے ملک اور قرابتوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے اس ملک میں جو میں تجھے دکھلاؤں گا، نکل چل، اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا۔ اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا اور اس کو جو تجھ پر لعنت کرتا ہے لعنتی کروں گا اور دنیا کے سب گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے۔"

یہ وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مروہ کی طرف ہجرت فرمائی ہے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کی جگہ ہے۔ اس وجہ سے اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عام برکت کا وعدہ ان کی ذریت کے واسطے سے پورا ہوگا۔ چنانچہ ایک دوسرے موقع پر اس کی صاف تصریح بھی فرما دی ہے۔

تکوین باب ۲۲ میں ہے:

"خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا...... اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔"

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اس برکت کا اصلی سبب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی ہے۔ ہر چند کہ یہ برکت اسحٰق علیہ السلام کی ذریت کے ذریعہ سے بھی پھیلی۔ لیکن اس کا اصلی سرچشمہ حضرت اسماعیلؑ ہی کی ذریت ہے۔ ایک دوسرے مقام پر اس کے متعلق ایک اہم حقیقت بیان ہوئی ہے۔

"ابرہام تو یقیناً ایک بڑی اور بزرگ قوم ہوگا۔ اور زمین کی سب قومیں اس سے برکت پائیں گی۔ کیونکہ میں اس کو جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے کو حکم کرے گا اور وہ خداوند کی راہ کی نگہبانی کر کے عدل اور انصاف کریں گے تاکہ خداوند ابراہام کے واسطے جو کچھ اس نے اس کے حق میں کہا ہے پورا کرے۔" تکوین باب ۱۸۔

یہاں برکت سے اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا۔ نیز اس سے ایک نئی حقیقت آشکارا ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو دین دیا گیا تھا اس کی حقیقت نیکی اور عدل تھی۔ اب غور کرو کہ آنحضرت صلعم کے ظہور سے یہ پیشین گوئی کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔ آپ کی بعثت اس سرزمین میں ہوئی جو ان تمام برکات کا سرچشمہ تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سرزمین کا اور دینِ ابراہیمی کا وارث بنایا اور آپ کی شریعت کی بنیاد نیکی اور عدل پر ہوئی۔ نیز آپ کی بعثت سے تمام روئے زمین کے لیے عام برکت کا وعدہ پورا ہوا۔ کیونکہ آپ کی رسالت تمام عالم کے لیے ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔
ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔
اور ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر۔

چونکہ آپ کی رسالت تمام عالم کے لیے ہے۔ اس وجہ سے وہ برکت بھی جو آپ کے ذریعہ سے دنیا میں پھیلی، آپ کے تمام پیروؤں کے لیے جو آپ کی ذات اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات پر برکت بھیجتے ہیں، عام ہوگی۔ یہ اس وعدہ کی تصدیق ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا تھا کہ:

"جو تجھے برکت دیتا ہے میں اسے برکت دوں گا۔"

اس کو دوسرے لفظوں میں زیادہ وضاحت سے یوں سمجھو کہ برکت کے معنی ہیں اہل و عیال کی کثرت کی دعا دینا۔ اس لیے اگر کوئی شخص کسی شخص کو برکت کی دعا دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اس کے اہل و عیال کو بھی خیر و برکت کی دعا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب ہم آنحضرت صلعم پر برکت بھیجتے ہیں تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر برکت بھیجتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جب ہم آنحضرت صلعم پر درود بھیجتے ہیں تو گویا آپ کی ذریت اور آپ کے آل پر بھی درود بھیجتے ہیں۔ اسی لیے نمازوں میں ہم یوں دعا کرتے ہیں۔

"اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ۔

یعنی تو نے جس طرح ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیمؑ پر رحمت نازل فرمائی اسی طرح محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر بھی اپنی برکت و رحمت نازل فرما تاکہ تیرا وعدہ پورا ہو۔

یہ برکت بھیجنے کا حکم دوسری امتوں کو نہیں دیا گیا۔ صرف مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔
اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر رحمت بھیجتے ہیں، اے ایمان والو تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو۔

اسی لیے ہم اپنی تمام نمازوں کو درود پر ختم کرتے ہیں۔

یہود و نصاریٰ اولاً تو نماز کی فرضیت کے قائل نہیں ہیں اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو حضرت ابراہیمؑ یا ان کی ذریت میں سے کسی

پر درود نہیں بھیجتے۔ یہ درود صرف آنحضرتؐ کی امت کا شعار ہے۔ ہم تشہد میں پہلے خدا کی بارگاہ میں "صلوٰت وطیبات" کی نذر گزرانتے ہیں پھر اس کے تمام صالح بندوں کے لیے اس کی رحمت و برکت مانگتے ہیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ آنحضرت صلعم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام لیتے ہیں تاکہ ان کے حقوق کا اعتراف کریں، یہ گویا اس نیکی اور عدل کی ایک فرع ہے جو نزول برکات کا سبب ہے۔

اس شریعت کی برکت عمومی کی شہادت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ اس میں ہم کو تمام دنیا کے ساتھ عدل اور احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (ممتحنہ-۸)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور عدل سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے دین کے بارہ میں لڑائی نہیں کی، اور تم کو تمھارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ عدل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ

اے ایمان لانے والو! اللہ کے لیے مستعد بنے رہو انصاف کے ساتھ شہادت دینے والے اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ تم عدل کو چھوڑ بیٹھو۔ عدل کرو کہ یہی تقویٰ سے اقرب ہے۔

اس شریعت کے جزئیات احکام بھی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے، عمومیت اور مساوات کی اس روح سے معمور ہیں۔ اور یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے کہ خانہ کعبہ کو اللہ تعالیٰ نے احسان اور عدل کا مرکز بنایا ہے۔ کیونکہ اس کا سنگِ بنیاد توحید ہے۔ اور اس کی تعمیر ذکر و شکر اور ہمدردی خلق کے لیے ہوئی ہے۔ اور قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ توحید راس العدل ہے کیونکہ اس نے شرک کو "ظلم عظیم" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔

بلا شبہ شرک ظلم عظیم ہے۔

اور پچھلے مباحث میں یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ نماز اور قربانی جس کا اس سورہ میں ذکر ہے، درحقیقت خانہ کعبہ کے بنیادی مقاصد یعنی توحید، ذکر و شکر، اور مواسات کے قیام و تحفظ کے لیے ہیں۔ یعنی بالواسطہ یہ تمام چیزیں بر و عدل کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔ اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ چونکہ خانہ کعبہ ہی تعلیم احسان و عدل کا مرکز ہے اس وجہ سے تمام برکات کا سرچشمہ بھی وہی ہوگا۔

یہ تمام باتیں اشارہ کر رہی ہیں کہ اس سورہ میں "کوثر" سے مراد "خانہ کعبہ" ہی ہے۔

اس سورہ کی تفسیر کی یہ آخری سطریں ہیں، جن کو لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔